شفیق الرحمن

لہریں

شفیق الرحمٰن

۱۹۴۴

میں اس کتاب کو بصد شوق و احترام

اپنے نام

معنون کرتا ہوں

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

اور

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ رنگ قبول

پھُول کچھ میں نے چُنے ہیں اپنے دامن کیلئے

وغیرہ وغیرہ

فہرست

ریویو

اس مضمون کی ابتدا ہی غلط ہے بھلا ریویو کا مطلب کیا ہوا؟ عنوان ریویو بازی یا ریویو نویسی ہونا چاہئے تھا۔ ریویو زنی اور ریویو نگاری بھی اچھے نام تھے۔

ایک غلطی ہم یہ کر رہے ہیں کہ ریویو پر ریویو کر رہے ہیں۔

ہم یہ بتا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ریویو کرنے کو تنقید نگاری بھی کہا جاتا ہے اور ہم اس مضمون میں صرف ان ریویوز کا ذکر کریں گے جو ادبی سلسلے میں ہوتے ہیں۔ انسانوں وغیرہ پر نہیں۔ کیونکہ خود ہمارے اوپر بارہا ریویو ہو چکے ہیں۔ ان کا ہم ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

ریویوزنی کے بہت سے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے ہمارے ادب میں بڑی ترقّی ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں تو بیجا نہ ہو گا کہ اس کے بغیر ادب میں ترقی ناممکن ہے۔ بھلا جب تک ادیبوں کو بُرا بھلا نہ کہا جائے وہ ادب کی خدمت خاک کریں گے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اسی سے ادیب اور پڑھنے والوں دونوں کو طرح طرح کے مواقع ملتے ہیں۔ مثلاً ادیبوں کو یہ سنہرا موقع ملتا ہے کہ وہ بیزار ہو کر لکھنا ہی چھوڑ دیں اور اپنا وقت کسی بہتر مشغلے میں صرف کریں اور پڑھنے والوں کے لئے ہنسنے ہنسانے کا سامان مہیّا ہو جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص ریویو کر کے ایک اچھے خاصے ادبی پہلوان کو منٹوں میں چِت گرا دیتا ہے، اور پھر دوسرے کی طرف لپکتا ہے تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ ہم بھی ایسے موقعوں پر بہت خوش ہوتے ہیں اور دیر تک خوش رہتے ہیں۔ اس کے بعد مصنّف کا ایک بھی مضمون نہیں پڑھتے۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ نئے شکاری جو لکھنے کے لئے بے قرار ہیں، دوسروں پر ریویو پڑھ کر عبرت حاصل کرتے ہیں اور ادیب بننے سے باز رہتے ہیں۔ اگر یوں نہ ہو تو بے شمار حضرات ادیب بن جائیں۔

ہم اپنا اور آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ ریویو بازی کے لاتعداد فائدے ہیں۔

شروع شروع میں ہم نے اس سلسلے میں غور نہیں کیا تھا لیکن ایک دفعہ ہمارے ایک ادیب دوست کو عجیب سانحہ پیش آیا جس نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔

ہمارے دوست ایک عرصے سے ادیب تھے ایک روز انہیں دفعتہً خیال آیا کہ اگر وہ ایک کتاب چھپوا دیں تو دنیا میں انقلاب آ جائے گا اور ادب کی سب سے بڑی کمی پوری ہو جائے گی۔ انہوں نے ہم سے مشورہ لیا۔ ہم نے کہا کہ ضرور چھپواؤ۔ چنانچہ خاصی محنت و مشقت کے بعد کتاب چھپی ۔ ہم کتاب پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ کتاب اچھی تھی۔ ہمارے دوست بھی پھولے نہ سمائے۔

چندماہ کے بعد ایک رسالہ میں اس کتاب پر ریویو چھپا۔ ہم نے پڑھا۔ کافی عرصہ کا ذکر ہے اس لئے ہم بھول گئے ہیں لیکن کہیں کہیں سے یاد ہے کچھ اس طرح تھا۔ "ایک نومشق کی پہلی کوشش ہے۔ اس لئے ہم اسے معاف کرتے ہیں۔ ہمیں ساری کتاب میں ایک بھی افسانہ پسند نہیں آیا۔ ایک مرتبہ تو ہم سچ مچ سوچنے بیٹھ گئے کہ واقعی یہ تحریریں افسانے ہی ہیں کیا؟ لیکن حقیقت کے اظہار میں نوجوان مصنّف کی دِل شکنی کا اندیشہ ہے اس لئے ہم اس بات کو یہیں چھوڑتے ہیں۔ افسانوں کے پلاٹ نہایت فرسودہ ہیں اور سب کے سب غیر ملکی ادب سے چرائے ہوئے ہیں۔ افسانوں کے عنوان بے تکے ہیں۔ زبان نہایت غلط ہے۔ تحریر میں روانی نام کو نہیں ۔ کتاب کے دیباچے میں بے شمار غلطیاں ہیں۔ دیباچے کا نہ سر ہے نہ پیر۔ کتابت نہایت ہی بُری ہے۔ کاغذ گھٹیا اور چھپائی نہایت ہی ردّی ہے۔ مصنّف نے اپنی تصویر کیوں نہیں شامل کی؟ خیر! ہم اسے معاف کرتے ہیں۔ چونکہ اس کی پہلی کوشش ہے اس لئے ہم اس کی دل شکنی ہرگز

نہیں کرنا چاہتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک افسانے میں بھی جان نہیں۔ انتساب بالکل بے معنی ہے۔ اس سے اچھا تھا کہ نہ کیا ہوتا۔ کتاب کی جلد بھی اچھی طرح نہیں۔ ٹائٹل تو اس قدر واہیات ہے کہ دیکھ کر ہمیں سخت غصّہ آگیا۔ لیکن پھر ہم نے سوچا کہ پہلی کتاب ہے جانے دو۔ کتاب کی قیمت بہت زیادہ ہے اور بہت زیادہ تعداد میں چھاپ لی گئی ہے۔ ایک ہزار تو ایک طرف اگر اس کتاب کی دس پندرہ کاپیاں بھی فروخت ہو جائیں تو ہمارا نام بدل دینا۔ لیکن مصنّف نوعمر ہے اور یہ اس کی پہلی کتاب ہے اس لئے ہم اس کی حوصلہ شکنی نہیں کرنا چاہتے۔ ہم اسے مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ کیا ہی اچھا ہو جو وہ صبر کرتے اور آئندہ کسی اور کتاب کے چھپوانے کی تکلیف نہ کرے، لیکن مصنّف کی چونکہ یہ پہلی کوشش ہے، اس لئے ہم۔۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔"

یہ ریویو پڑھ کر ہمیں بڑا صدمہ ہوا۔ ہمارے دوست نے ریویو زن صاحب کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مضمون نویسی سے توبہ کرلی۔ آج کل وہ پولیس میں افسر ہیں۔

بات آئی گئی ہوئی لیکن ہمارے دل پر ریویو نویسوں کا سخت رُعب بیٹھ گیا اور ہمیں دنیا بھر کے ادیبوں سے نہ جائے کیوں ہمدردی ہو گئی۔

ایک دن ہمارا تعارف ایک ریویوز باز حضرات سے کرایا گیا جو ریویوز بازی کیلئے دور دور تک مشہور تھے۔ پوچھئے مت ہمارا کیا حال ہوا ہے اس وقت، لیکن ہماری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب وہ صاحب ہفتہ بھر میں ہمارے دوست بن گئے۔ وہ سچ مچ ایک معمولی انسان تھے۔ پہلے تو ہم ہچکچاتے رہے۔ آخر ایک دن ڈرتے ڈرتے ریویوز زنی کا ذکر چھیڑ دیا۔ ان کی تعریفیں بھی کیں کہ ایسے اچھے ریویو کر لیتے ہیں۔ اپنی کمزوریاں ظاہر کیں کہ جب کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو طربیہ حصّے پر ہنستے ہنستے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں اور حزنیہ حصّے پر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ہمیں ہر کتاب پسند آجاتی ہے۔ اور ہمارا دل اس قدر کمزور ہے کہ وہ کسی پر ریویو نہیں کر سکتا۔ تب وہ حضرت بڑے زور سے ہنسے اور بڑی دیر تک ہنستے رہے۔ جب ہنس چکے تو یکلخت رونے لگے۔ بالکل الف لیلہ کے اس شہزادے کی طرح جو پرستان میں کسی دیوتا یا شاید کسی پری کو دیکھ کر ہنسا تھا پھر رو پڑا تھا۔ وجہ پوچھی تو بولے تمہاری جہالت پر رونا آرہا ہے۔ تمہاری بے بضاعتی پر رو رہا ہوں۔

بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر انہوں نے سوال پوچھا، "کیا تم بھی ریویو باز بننا چاہتے ہو؟"

ہمارا دل دھڑکنے لگا۔ کہاں ریویو بازی اور کہاں ہم، ہم نے سر جھکایا اور شرما کر رہ گے لیکن انہوں نے کچھ ایسی حوصلہ افزا باتیں کیں کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ ریویو کرنا بہت آسان کام ہے۔

"لیکن آپ کو مطالعہ بہت کرنا پڑتا ہو گا" ہم نے پوچھا۔

"مطالعہ۔۔۔ کیسا مطالعہ؟۔۔۔ اور کیوں مطالعہ؟"

"آپ پہلے ایک کتاب کو کئی مرتبہ پڑھتے ہوں گے تب جا کر کہیں ریویو کرتے ہوں گے۔ نہایت وسیع مطالعہ ہو گا آپ کا۔"

"لاحول ولا قوۃ! اگر مطالعہ کر کے ریویو کرنے لگے ہو تو ہو چکے ریویو، مطالعہ کون مسخرہ کرتا ہے۔"

"ہیں! تو کیا سچ مچ۔۔۔!"

"ہاں! سچ مچ میں کتابیں نہیں پڑھتا۔ اگر ذرا سی مشق ہو جائے تو کتاب کو دیکھ کر یا سونگھ کر ریویو کے صفحے کے صفحے لکھے جا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد وہ ہمارے اُستاد بن گئے اور ہم ان کے شاگرد۔ انہوں نے ہمیں یہ فن سکھنا شروع کیا۔ محض چند ہفتوں کی تعلیم کے بعد ہم نے بھی ریویو بازی

شروع کر دی۔ سب سے پہلا ریویو ہم نے ایک دیوان پر کیا (دیوان وہ کتاب ہوتی ہے جس میں شعر ہی شعر ہوتے ہیں۔) یہاں ہم واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم نے ایک شعر بھی نہیں کہا اور یہ فی الحال کوئی ارادہ ہے اور نہ ہمیں شعروں کی کوئی پرکھ ہے، پھر بھی ہم نے ریویو کر دیا اور وہ ریویو اس قدر مقبول ہوا کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس ریویو کے لئے دھڑا دھڑ کتابیں آنا شروع ہو گئیں۔ وہ ریویو کچھ اس طرح تھا۔

موجودہ شاعری آج کل جس دشوار اور کٹھن منزل سے گزر رہی ہے اس کا بیان ہماری طاقت سے باہر ہے۔ یہ دشوار و پُرخطر راستہ جس میں جگہ جگہ رکاوٹیں ہیں، نہایت ہی بیہودہ راستہ ہے۔ ہمارے خیال میں موجودہ شاعری کو کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ خیر، اب جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

اب مثال کے طور پر شاعر موصوف کے دیوانِ مذکور میں سے ایک نظم پیش کرتے ہیں۔ اس میں شاعر نے ایک نہایت ہی مشکل مضمون کو بڑی خوبی کے ساتھ نبھایا ہے۔ پرانی شاعری میں اس خیال کو ہرگز بیان نہیں کیا جا سکتا، لیکن موجودہ شاعر نے ہمارے لئے نئی راہیں کھول دی ہیں۔

نظم ملاحظہ ہو:

لڑ رہی ہیں بلّیاں

اف بلّیاں

باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں بلّیاں !

دُھندلکا ہے شام کا

وقت ہے آرام کا

کام کا

انعام کا

اور لڑ رہی ہیں بلّیاں !

ہوں گی شاید چار یہ

یا تین ہوں

لیکن ذرا سا یہ شبہ دل میں ہے میرے بڑھ گیا کہ بلّیاں یہ پانچ ہیں

اور چھ تو ہو سکتی نہیں!

اور چاندنی سی رات ہے

اور چاند نکلا ہوا

اور چاندنی ہے چار سو

اور چار دن کی چاندنی

اور پھر اندھیری رات ہے

کیا کہہ رہا تھا میں بھلا

اُفّوہ ابھی تو یاد تھا

اس حافظے کو کیا ہوا

کم بخت سے سمجھے خدا

ہاں مجھ کو یاد آ ہی گیا

کہ لڑ رہی ہیں بلّیاں!

باغ میں اس وقت شاید لڑ رہی ہیں بلّیاں!

کیا بات ہے سبحان اللہ! جزاک اللہ! مرحبا! دیکھا آپ نے؟ اگر نہیں دیکھا تو پھر دیکھیے۔ مزاح و متانت کا امتزاج رومان و حقیقت کا عجیب و غریب اتصال شاعر نے کیا ہلکی پھلکی اور دبلی پتلی نظم کہی ہے!

بلّیوں پر آپ نے آج تک کوئی غزل پڑھی؟ غالباً نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو بلّیوں سے بے حد عقیدت ہے۔ اور ہونی بھی چاہیے۔

ذرا دماغ میں تصویر بنایئے۔ چاندنی رات، باغ کا ایک تنہا گوشہ، شاعر کا بے چین دل اور کہیں دور سے بلّیوں کے لڑنے کی آواز۔ اف خدایا! کیا کوئی اور چیز اس سے زیادہ رومان انگیز ہوتی ہے؟ شاعر کو بھی یقین نہیں کہ یہ بلّیاں ہی ہیں! اس نے لفظ شاید کو استعمال کر کے نظم کو نامعلوم بلندیوں پر پہنچادیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت باغ میں کتّے ہی بھونک رہے ہوں لیکن شاعر کو بلّیاں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اور پھر شاعر یہ بھی نہیں جانتا کہ ان بلّیوں کی تعداد کتنی ہے۔ کتنی مزیدار بات ہے۔ لیکن اسے یقین ضرور ہے کہ چھ سے کم ہیں۔ چاندنی میں شاعر کو اندھیری راتیں یاد آتی ہیں۔ جب باغ میں اندھیرا ہو گا اور بلّیاں بھی نہیں لڑیں گی۔ بے ثباتیٔ عالم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ لیکن انتہائی کمال شاعر نے وہاں دکھایا ہے جہاں وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ وہاں

وہ اپنے حافظے کو کوستا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگ ایسے وقت اپنے حافظے کو کوستے ہیں۔ یہاں ہم حقیقت نگاری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس سلسلے میں ہم ایک شاعر کی غزل پیش کرتے ہیں (یہ ہم اپنی طرف سے کہہ رہے ہیں) پرانی شاعری میں بندشیں بہت تھیں اور ہم جذبات کا اظہار کرتے وقت گھٹ کر رہ جاتے تھے۔ لیکن جدید شاعری میں بڑی وسعت ہے۔ یہاں تک کہ جو کچھ ہم بولتے ہیں اسے براہِ راست شعروں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "اماں ٹھہرو بھی سہی" یا "ارے ارے" اور "اوں ہوں" کو بھی قافیہ (یا ردیف) رکھ سکتے ہیں۔

اب ہم اپنے محترم دوست ازہر صاحب کی ایک غزل پیش کرتے ہیں۔ ہم نے جہاں چ چ لکھا ہے اسے آپ چچ چچ پڑھیے، جو اظہارِ افسوس پر مُنہ سے نکل جاتا ہے۔

قصّہء قلبِ ناتواں چ چ

دکھ بھری ہے داستان چ چ

ہر حسین شکل پر خود آ جانا

خود ہی پھر نالہ وفغان چ چ

تیر کھانا ہر ایک کی نظروں کے

اور دینا دہائیاں چچ چچ

فصلِ گل میں غم آشیانے کا

گلہ آمدِ خزاں چچ چچ

درِ جاناں پہ خود ہی جا جا کے

کھانا درباں کی گالیاں چچ چچ

اک تو یہ دل کی بے تکی باتیں

اس پر تخیلِ شاعراں چچ چچ

الغرض شیخ جی محبّت کی

ایسی ہی کچھ ہے داستان چچ چچ

کیا کوئی ایسی غزل آج سے پچاس سال پہلے کہہ سکتا تھا؟ ہر گز نہیں۔ یہاں ہمیں دو شعر اور یاد آ گئے۔

جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے

جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

لفظ ''نہیں'' نے شعر کو چار چاند لگا دیئے۔ کیا معصومیت پیدا ہو گئی۔ سبحان اللہ! دوسرا شعر ہے۔

کہیں کرتا ہے کوئی یوں جفائیں نازنیں ہو کر

نہیں کرتا ہے کوئی یوں جفائیں نازنیں ہو کر

''وغیرہ وغیرہ۔'' غرض یہ کہ اس قسم کا ریویو کوئی پچاس صفحات کا تھا اور وہ دیوان کل چالیس صفحے کا تھا۔ ریویو اس قدر مقبول ہوا کہ کیا عرض کروں۔ اسے موجودہ دور کا بہترین ریویو قرار دیا گیا اور ہمارا نام ہر جگہ مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے جو ریویو کرنے شروع کئے ہیں تو ایک ایک دن میں آٹھ آٹھ کتابوں پر ریویو کر دیے۔ کتاب کو دو تین منٹ پڑھا اور ریویو کر دیا۔ کتاب کو سونگھا اور ریویو کر دیا۔ کتاب کو دُور سے دیکھا اور ریویو کر دیا۔ ایک پر تو ہم نے بغیر دیکھے ریویو کر دیا جو حسبِ معمول بے حد مقبول ہوا۔

لیکن ہمیں وہ سانحہ یاد تھا جو ہمارے پرانے دوست پر گزرا تھا، چنانچہ ہم ان سے ملے اور کہا کہ قبلہ اب ایک کتاب لکھئے اور پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھئے۔ میں

ایسا ریویو کروں گا کہ اگلی پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ انہوں نے معذرت کی اور بولے۔ "مجھے اب نہ کتابیں لکھنے کے فرصت ہے نہ پڑھنے کی۔ ہم نے پوچھا آپ کا کوئی دوست کتاب لکھ رہا ہو۔ لکھ چکا ہو، یا لکھنے کا ارادہ رکھتا ہو تو ہمیں بتا دیجئے۔ وہ بولے میں دریافت کروں گا۔ انہوں نے جب دوستوں سے پوچھا تو سب نے معذرت کی اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے دوستوں سے پوچھیں گے۔ اور جب انہوں نے اپنے دوستوں سے پوچھا تو وہ بھی معذرت کر گئے۔ غرضکہ اسی طرح یہ پیغام دُور تک پہنچ گیا۔ اور آخر ایک صاحب ہم سے ملنے آئے جو ہمارے دوست کے دوست کے دوست تھے۔ انہوں نے ازراہِ کرم ہمیں اس دکان کا پتہ بتایا جہاں سے ہم ان کی کتاب خرید کر اس پر ریویو کر سکتے تھے۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ چلتے وقت وہ بولے ذرا خیال رکھئے گا۔ ہم نے مُسکرا کر کہا آپ بے فکر رہیے۔

ہم نے شام کو کتاب خریدی اور علی الصبح ریویو کر پریس بھیج دیا۔ ریویو کچھ ایسا مقبول ہوا کہ ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔

اس ریویو کا کچھ حصّہ ملاحظہ ہو۔ کچھ حصّہ اس لئے کہ ہمارے ریویو بے حد طویل ہوتے ہیں۔

"یہ اور وہ" حضرت آب تربوزی کے دو افسانوں کا مجموعہ لکھائی دیدہ زیب، چھپائی زرق برق۔ کاغذ سفید اور چکنا، دیباچہ از حضرت بدنصیب مجذوبی، مصنّف کی تین تصویریں شامل ہیں۔ ضخامت ستّر صفحے، قیمت صرف پونے چار روپے جو زیادہ نہیں۔

مصنّف نے صرف دو افسانے لکھ کر اُردُو ادب میں ایسا نام پیدا کیا ہے جو کوئی اور ادیب دو افسانے لکھ کر ہرگز پیدا نہیں کر سکتا۔ ان گنے گنائے صفحات میں زندگی کی تفسیریں پیش کی گئی ہیں کہ پڑھنے والا عش عش کرنے لگتا ہے۔ حسن و عشق کی گھاتیں۔ چوری کی ملاقاتیں۔ نفرت و عداوت کے قصّے۔ دیوانی اور فوجداری کے قصّے۔ زمین کاشت کرنے کے نئے نئے طریقے۔ جانوروں اور پرندوں کے متعلق دلچسپ باتیں۔ کھانوں کی ترکیبیں، کیا ہے جو اس کتاب میں نہیں ہے۔

پہلے افسانے میں جہاں ہیرو اور ہیروئن اُونٹ پر سوار ہو کر بھاگ جاتے ہیں، وہاں مصنّف کی حساس طبیعت اور تیز نگاہیں اُونٹ کو نظر انداز نہیں کر دیتیں۔ مصنّف اُونٹ کے متعلق لکھتا ہے، "اُونٹ ایک مستطیل نما" جانور ہے۔ جس کا ہر کونہ زاویہ قائمہ ہے۔ اُونٹ کی گردن کے دھڑ سے پنتالیس درجے کا زاویہ بناتی ہوئی دفعتاً جسم سے مل جاتی ہے اور لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ اُونٹ کی پیٹھ

پر ایک اُبھری ہوئی نوک دار چیز ہوتی ہے جسے کوہان کہتے ہیں۔ یہ اُونٹ کو دو حصّوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اُونٹ خورد اور اُونٹ کلاں۔

اُونٹ کی گردن اس لیے بھی لمبی ہے کہ اس کا سر اس کے جسم سے خاصا دُور ہے۔

اُونٹ ایک شریف الطبع، اشرف المخلوقات، مخبوط الحواس اور مہمان نواز جانور ہے۔ اس کا ذکر دنیا کی ہر مذہبی کتاب میں موجود ہے۔

اُونٹ کو عربی میں شتر اور انگریزی میں کیمل کہتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک شہر کیمل پور بھی ہے۔

اُونٹ کی طبیعت میں انکسار پایا جاتا ہے، وہ مغرور بالکل نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہ اس کے پاس مغرور ہونے کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

''اُونٹ رے اُونٹ، تیری کون سی کل سیدھی'' غلط کہاوت ہے۔ یہ اُونٹ پر تہمت ہے، سراسر بہتان ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ پانی پیتے وقت اُونٹ کی گردن بالکل سیدھی ہو جاتی ہے اور خطِ مستقیم بناتی ہے۔ اُونٹ مہینوں تک ناشتہ کیے بغیر رہ سکتا ہے۔ اسے صحرائی جہاز کا خطاب دیا گیا ہے لوگوں کا خیال ہے کہ جب وہ دُور سے اُونٹ کو دیکھتے ہیں تو اُنہیں جہاز یاد آ جاتا ہے۔ لیکن جہاز کو دیکھ

کر اُنہیں کیا یاد آتا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں۔ اُونٹ جب چھوٹا ہوتا ہے تو بھی تقریباً اتنا بڑا ہوتا ہے جتنا ایک بڑا اُونٹ۔

اس کی سواری سے صحت بہت اچھی رہتی ہے، ورزش کی ورزش ہو جاتی ہے اور سوار سطحِ سمندر سے کافی بلند رہتا ہے۔ اُونٹ کی چال بڑی متوالی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک گوّیے نے اُونٹ کو چلتے دیکھ کر اپنا مشہور راگ رم جھم رم جھم چال تمہاری گایا تھا اور اُونٹ نے سنا بھی نہیں۔

اُونٹ کبھی کبھی صحرا میں ناچتا بھی ہے لیکن اکیلے ہی اکیلے۔۔۔ جنگل میں اُونٹ ناچا کس نے دیکھا۔

اُونٹ کو ایک دُم عطا ہوئی ہے۔ نصف جس کے نصف دُم ہوتی۔ لیکن دُم کی اہمیت اس قدر اہم نہیں کیونکہ بغیر دُم کے اُونٹ بھی پائے جاتے ہیں۔ زرد رنگ کا اُونٹ زرد ہوتا ہے اور بھورا اُونٹ بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔

اُونٹ پر دنیا کا مشہور ترین شعرا نے شعر کہے ہیں۔ ایرانی ادب میں اُونٹ اور بلبل کا ذکر ہے۔

ہندوستان میں بھی اُونٹ نواز شاعر گزرے ہیں۔ ایک شعر ہے۔

اُونٹ ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو

کاش کہ تم میرے لئے ہوتے

ایک اور شعر ہے۔

گیا ہے اُونٹ کوئی اس طرف سے

پتہ دیتی ہے شوخیٔ نقشِ پا کی

ایک گیت ہے۔۔۔۔ اے اُونٹ کہیں لے چل۔

اور لطف یہ ہے کہ ایک مکمل اُونٹ بننے میں فقط تین سال لگتے ہیں۔۔۔۔

ملاحظ فرمایا آپ نے، حقیقت نگاری کی حد ہو گئی۔

مصنّف کی نگاہیں کہاں کہاں جا پہنچتی ہیں۔ کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ پھر ایک جگہ مصنّف نے شادی کے نازک مسئلہ کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

یہاں ہمیں ایک کہانی یاد آ گئی۔ کسی نے سقراط سے پوچھا "ٹھہریے" شاید بقراط سے پوچھا تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد نہیں رہا۔ کیونکہ ہم اس موقع پر موجود نہیں تھے ممکن ہے کہ جالینوس یا فیثا غورس آیا سے ہی پوچھ لیا ہو۔ بہر حال اسی قسم کے ایک پرانے عقلمند سے کسی نے پوچھا کہ جناب میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے مشورہ دیجئے کہ کر بیٹھوں یا کنوارا رہوں؟ جواب ملا برخوردار شادی کرو گے تب بھی پچھتاؤ گے اور جو کنوارے رہو گے تب بھی پچھتاؤ گے۔

پھر ایک چینی عالم (یعنی چین کے عالم، آپ کہیں برتن ورتن نہ سمجھئے) جی تو ایک چینی عالم ہشت ہشت سے اس کے شاگرد چونگ چینگ چانگ نے پوچھا کہ اے اُستاد کیا سچ ہے کہ شادی شدہ حضرات کنواروں سے زیادہ دیر زندہ رہتے ہیں اور ان کی عمریں طویں ہوتی ہیں۔ اُستاد نے فوراً جواب دیا۔۔۔۔ اے پیارے شاگرد وہ دراصل طویل تو نہیں ہوتیں بلکہ انہیں محسوس ہوتی ہیں کہ بے حد طویل ہیں۔

اسی طرح مشہور چینی سیّاح چیاؤں میاؤں ہینگ نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ شادی شدہ انسان در حقیقت نصف انسان ہوتا ہے۔ معاف کیجئے ہم کہاں پہنچ گئے۔

پھر مصنّف نے ہمارے سماج کا مذاق اڑایا ہے۔ ہماری معاشرت پر وہ خوب ہنسا ہے۔ ہمارے تعلیمی معیار پر وہ لکھتا ہے ہمیں امتحان میں پاس ہونے کے لئے ۳۳ فیصدی نمبر درکار ہیں۔ یعنی اگر تین سوالوں میں سے ایک کا جواب صحیح ہو تو ہم معیار پر پورے اُترتے ہیں اور کامیاب قرار دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے سامنے ایک الّو بٹھا دیا جائے اور پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے؟ ہم کہہ دیں کہ

خرگوش ہے تو ہمیں دوبارہ سوچنے کو کہا جاتا ہے۔ پھر ہم کہدیں کہ یہ قُمری ہے، ہمیں ایک اور موقع ملتا ہے اور اگر ہم تیسری مرتبہ کہدیں کہ یہ الّو نما پرندہ ہے جس کی ہر بات سے الّوپن ٹپکتا ہے تو ہم پاس ہو جاتے ہیں۔ اب اس "فیصدی" کو ہی لے لیجئے۔ ہر روز پڑھتے ہیں کہ یہاں دس فیصدی آدمی کمزور ہیں۔ اس کلاس میں پندرہ فیصدی بچّے بیمار رہتے ہیں۔ اچھا اب فرض کیجئے کہ ایک مکان میں دس آدمی رہتے ہیں اور ان میں اتفاق سے ایک کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اگر آس پاس کوئی ریاضی داں حضرت ہوئے تو حساب لگا کر فوراً کہدیں گے کہ اس مکان میں باقی جو نو آدمی ہیں اُن میں سے ہر ایک کا دس فیصدی انتقال ہو چکا ہے۔ اور جس غریب کا انتقال ہوا ہے وہ نوّے فیصدی تندرست ہے۔ خیر یہ تو کچھ بھی نہیں۔ سب سے عجیب و غریب چیز اکائی کا قاعدہ ہے۔ ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک ڈھائی فٹ لمبا کتّا جس کی دُم ڈیڑھ فٹ لمبی ہے۔ سارے دن میں اپنے پنجوں سے چھ مربع فٹ زمین کھود ڈالتا ہے تو ایک پندرہ میل لمبا کتّا جس کی دُم نو میل لمبی ہو ایک نئی نہر سویز کو دو سال ایک مہینہ دو دن اور پونے چار گھنٹے میں کھودے گا۔

مصنّف کا مطالعہ بیحد وسیع ہے۔ باتوں باتوں میں وہ دور دور تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر فوراً واپس آ جاتا ہے جہاں ہیروئن ہیرو کے فراق میں گاجریں کھا رہی ہے۔ وہاں وہ گاجروں کے متعلق لکھتا ہے۔۔۔۔ گاجرں کو اچھی طرح نہیں

توڑا جاتا۔ اور گاجروں کی ایک بہت بڑی مقدار ضائع ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں گاجریں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر حالات اسی طرح رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہم ہندوستانی گاجروں کو ترسیں گے ۔ گاجروں کو توڑنے کا بہترین وقت وہ ہے جب وہ نہ بہت کچی ہوں اور نہ بہت پکّی۔ نہ بہت ملائم ہوں اور نہ بہت سخت۔ نہ بہت میٹھی ہوں اور نہ بہت پھیکی۔

گاجریں توڑنے والے گاجروں کے درخت پر چڑھ جائیں۔ ایک لمبے سے رسّے کی مدد سے وہ آسانی سے چڑھ سکتے ہیں۔ ویسے احتیاط کرنا چاہئے۔ کیونکہ گاجروں کا درخت کافی چِکنا ہوتا ہے اور پھسلنے کا ڈر ہوتا ہے۔ نیچے زمین پر چادریں بچھا دی جائیں اور درخت کی ٹہنیاں خوب زور سے ہلائی جائیں۔ گاجریں نیچے چادروں پر جا گریں گی۔۔۔۔

اب آپ خود سوچئے کہ رومانی افسانوں میں ایسی مفید باتیں کون بتاتا ہے؟ یہ کسی کسی کا کام ہے۔

مصنّف نے نئے نئے الفاظ اختراع کیے ہیں جو یقیناً بہت جلد ہمارے ادب میں عام ہو جائیں گے۔ چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔

چھاس۔ پیاس کے وزن پر چھاس بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پیاس پانی کی ہے اور چھاس چاء کی۔ مثلاً کوئی سہ پہر کو کہے بھئی مجھے سخت چھاس لگی ہے۔

پوشیدہ غنچی۔ یعنی چھپ کلی۔ چھپکلی ویسے غیر مانوس سانام تھا۔

دستی۔ ہاتھی غیر رومانی چیز معلوم ہوتی تھی۔

قمریا۔ چندیا۔ یہ کہنا کہ اس کی چندیا پر ایک بھی بال نہیں کتنا فضول معلوم ہوتا ہے۔ اس کی جگہ اس کی قمریا پر ایک بھی بال نہیں۔ کس قدر بہتر ہے۔

اب ہم چند رومانی سین پیش کرتے ہیں۔ مصنّف نے کمال چابکدستی سے یہ سین پیش کیے ہیں۔ دوسرے افسانے کا ایک مختصر سا حصّہ ہم نقل کرتے ہیں۔۔۔۔۔

ایک نہایت ہی خوشنما باغ میں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ باغ میں ایک پھول بھی نہیں تھا۔ پھر بھی نہ جانے کہاں سے خوشبو آرہی تھی۔ وہاں بہت سی سڑکیں تھیں۔ ہر سڑک ساڑھے دس فٹ چوڑی اور سو فٹ لمبی تھی۔ سو فٹ کے بعد وہ فوراً ایک اور سڑک سے مل جاتی تھی۔ اس طرح سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر سڑک پر دورویہ درخت کھڑے مُسکرا رہے تھے۔ ایک ایک لائن میں چالیس چالیس درخت تھے۔ ہر درخت کی پچاس پچاس ٹہنیاں اور ہر ٹہنی پر پانچ پانچ

پرندے بیٹھے گا رہے تھے۔ سارے باغ کے پرندے ایک وقت ایک سُر گاتے تھے۔ ہر سات منٹ کے بعد سُر تبدیل ہو جاتی تھی۔

یہ پڑھ کر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے اور بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ مصنّف لکھتا ہے۔ ہیروئن نے بڑے پیار سے پوچھا۔ "میں ایک ماہ سے دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی جرابیں مختلف رنگ کی ہوتی ہیں۔ آپ ہر روز ایک پاؤں میں سُرخ جراب پہن کر آتے ہیں اور دوسرے میں سبز۔"

ہیرو نے ایک گھٹنے پر جھک کر اپنا ایک ہاتھ دل پر رکھا اور نہایت ہی دردناک لہجے میں بولا۔۔۔۔ "میں تمہیں کس طرح بتاؤں کہ یہ دو مختلف جرابیں نہیں۔ بلکہ جرابوں کا ایک جوڑا ہے۔"

ہیروئن نے شرما کر کہا۔ "بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ایک جوڑا ہمارے گھر میں پڑا ہوا ہے۔"

بس اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں لکھیں گے باقی آپ کتاب میں پڑھیئے۔ ہم اس فقرے پر اپنا ریویو ختم کرتے ہیں کہ ہمارے ادب میں ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔

خیر صاحب! ریویو تو بے حد مقبول ہوا لیکن ساتھ ہی لوگوں کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ ہم ہمیشہ ریویو میں تعریفیں ہی کرتے ہیں اور مصنّف کو اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم ہر ایک کتاب پر ریویو لکھ مارتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

نتیجہ نکلا کہ ایک روز ہمیں ایک خط ملا جس میں ایک صاحب نے بڑی بے نیازی سے ہمیں لکھا تھا۔ ''اپنی کتاب کی تین کاپیاں بذریعہ وی پی بھیج رہا ہوں۔ ان میں سے ایک پر ریویو کر دیجئے۔ اگلے ہفتے تک ریویو چھپ جانا چاہئے۔ مجھے بہت جلدی ہے اور میں زیادہ سے زیادہ آپ کو دس دن کی مہلت دے سکتا ہوں۔ جن جن پرچوں میں آپ ریویو چھپوائیں۔ ہر ایک کی ایک ایک کاپی مجھے بھیجیں۔''

یہ خط ہمیں بڑا ضرور معلوم ہوا۔ لیکن ہم چپ رہے۔ وی پی ہم نے وصول کر لی۔ کھول کر جو دیکھتے ہیں تو اندر نہ جانے کیا کیا الا بلا نکلی، بینائی بخش سرمہ، قوت بخش حلوا، فرحت بخش شربت، کسی مولا بخش، خدا بخش اینڈ سنز اینڈ ڈاٹرز نے ہمیں بھیجا تھا۔ بڑی کوفت ہوئی۔ مصنّف صاحب کو خط لکھا جواب ملا کہ آپ کے نام تیس گز ریشم وی پی کرا رہا ہوں۔ اسی پارسل میں میری کتاب بھی ہو گی۔ دل پر جبر کر کے ہم نے وہ پارسل بھی وصول کر لیا۔ اس میں کتاب نہ ملی۔

جھنجلا کر پھر ایک خط لکھا۔ جواب ملا معاف کیجئے گا۔ کارخانے والوں سے پیکنگ میں غلطی ہوئی۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ کتاب کے لیے کس قدر بے چین ہوں گے۔ ریویو کرنے والے بعض اوقات تو انتظار کرتے کرتے بے صبر ہو جاتے ہیں۔ آپ نے واقعی کافی انتظار کیا ہے۔ اب کل آپ کے نام پندرہ جوڑی جوتے، گھوڑے کی زین اور اُونٹ کے دو کجاوے وی پی کرا رہا ہوں۔ اس پارسل میں کتاب ضرور ہو گی۔

ہمیں بے حد غصّہ آیا۔ ہم نے فوراًبازار سے ان کی کتاب خریدی اور ساری رات کتاب پر ضائع کر دی۔ دوسرے روز مندرجہ ذیل ریویو پریس میں بھیج دیا۔

سلطانہ اور دیگر افسانے۔۔۔۔۔ از حضرت شتر بے مہاری۔ کاغذ کھردرا، لکھائی بے کار، چھپائی اور بھی بے کار، گٹ اپ سرے سے غائب۔ سب سے پہلے تو ہمیں اس کتاب کا نام بالکل پسند نہیں آیا۔ اس نام سے فوراًسلطانہ ڈاکو یاد آجاتا ہے۔ کتاب میں تیرہ افسانے ہیں۔ تیرہ کا عدد نہایت منحوس ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے افسانوں پر نحوست برس رہی ہے۔

صفحات کی تعداد چار سو بیس ہے۔ جو نہایت خطرناک سا ہندسہ ہے۔ کاغذ نہ صرف کھردرا ہے بلکہ ردی میں خریدا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ڈھائی روپے قیمت

بہت زیادہ ہے۔ ہمارے خیال میں تو اس مجموعے کی قیمت آٹھ دس آنے کافی تھی۔

یہ مجموعہ قلندر علی، قلندر علی اینڈ قلندر علی نے چھاپا ہے جو ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ انہیں لوگ اکثر پسند نہیں کرتے۔ اس کارخانے کے مالک کا بڑا لڑکا اس وقت جیل میں ہے اور چھوٹا اس قدر شرابی ہے کہ کیا عرض کریں۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ۔۔۔۔ اوہ معاف کیجیے۔ ہاں! تو کتاب کا ٹائٹل ایک فلمی سین کا چربہ ہے۔ ہم بتائیں یہ سین کس فلم کا ہے یہ سین فلم ''رباعیاتِ علی بابا'' سے لیا گیا ہے۔ جہاں مس طوطا مینا، ماسٹر پہلوان کا انتظار کر رہی ہیں۔ ویسے یہاں مس طوطا مینا کو بے حد موٹا دکھایا گیا ہے۔ کاش کہ مس موصوفہ اسے دیکھیں اور قلندر حضرات پر دعوٰے کر دیں تاکہ ان کی ساری مستی اور قلندری کافور ہو جائے۔ مصنّف نے اپنی تصویر بھی شامل کی ہے۔ کاش کہ وہ کسی قلندر سے مشورہ کرتے تاکہ یہ نوبت ہی نہ آتی۔ تصویر میں بے شمار خامیاں ہیں۔ مصنّف کا ایک کان بڑا ہے اور دوسرا برابر ہے۔ یا یوں کہ ایک کان اوسط ہے اور اس کان سے چھوٹا ہے جو کہ بڑا ہے۔ اور وہ بڑا کان اس چھوٹے کان کے مقابلے میں محض اس لیے بڑا دکھائی دیتا ہے کہ چھوٹا کان باوجود اوسط درجے کا ہونے کے اس کان سے جو۔۔۔۔ معاف کیجیے۔ تصویر دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ مصنّف نے کئی دنوں سے حجامت نہیں بنوائی۔ اس کی ٹائی کی گرہ غلط ہے۔ اس کے

سوٹ میں بے شمار سلوٹیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج تک استری نہیں کیا گیا۔ یا کسی گھڑے میں سے نکالا گیا ہے۔ مصنّف نے ٹائی کالر بٹن کے بغیر ہی لگائی ہے۔ ہمارے دل میں ایک شبہ سا پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں یہ سوٹ کسی اور کا تو نہیں۔

دیباچہ ہے تو سہی لیکن دیباچہ لکھنے والے کا نام نہیں لکھا گیا۔ اس لیے ہمارا اندازہ ہے کہ دیباچہ خود مصنّف ہی نے دھر گھسیٹا ہے۔ اس میں نہ مصنّف کے متعلق کچھ لکھا ہے نہ اس کی تحریروں کے تعلق۔ محض اِدھر اُدھر کی باتیں کی ہیں۔

اب رہی کتابت، سو کاتب نے آخر صفحے پر اپنا نام، محلہ، شغل، شہر اور وہاں کی آب و ہوا۔۔۔ سب کچھ لکھ مارا ہے جو کہ نہایت بُری بات ہے۔ کاتب نے جگہ جگہ غلطیاں کی ہیں۔ اُس نے کئی جگہ بالم کو سالن اور سیّاں کو سوّیاں لکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت کاتب کو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ ایک جگہ حور شمائل نازنین لکھ کر افسانے کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ کاتب نے محاورے بھی غلط لکھے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے۔ اُلٹا کوتوال چور کو ڈانٹے۔۔۔ کتّا دیکھے گا تو ضرور بھونکے گا وغیرہ وغیرہ۔

چاسویں صفحے پر سیاہی کا ایک بڑا دھبّہ ہے جو وہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کتاب کے آخر میں چند اشتہارات دیے گئے ہیں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں۔ ایک

دکان کے مینجر صاحب نے اشتہار دیا ہے۔ ”کسی دوسری دکان پر جاکر دھوکہ نہ کھائیے۔“

”ہمارے ہاں تشریف لائیے۔“

دوسرا اشتہار کتّوں کے متعلق ہے۔ دو کتّے فروخت کے لیے ہیں۔ اشتہار ہے۔ ”دو موٹے تازے کتّے ایک سیاہ، دوسرا سفید۔ نہایت وفادار اور سمجھدار، رات کو خوب بھونکتے ہیں۔ جو دے دو بڑے شوق سے کھا لیتے ہیں۔ بچّوں کو خاص طور پر پسند کرتے ہیں۔“

اب رہا افسانوں کے متعلق، سو ان میں ایک بھی ایسا نہیں جسے افسانہ کہا جا سکے۔ جگہ جگہ غیر ملکی ادب سے چوری کی گئی ہے۔ پلاٹ، مکالمے، گانے، منظر کشی، رسہ کشی، غرضیکہ ہر چیز غیر ملکی ہے۔

پہلے افسانے میں جہاں ہیرو بغیر لیمپ کے سائیکل چلاتا ہوا پکڑا جاتا ہے۔ یہ مشہور انگریزی ناول دبڑ گاؤں سے نقل کیا گیا ہے۔ چوتھے افسانے میں جہاں ہیرو کی پٹائی ہوتی ہے اور پٹ پٹ کر اس کا برا حال ہو جاتا ہے۔ یہ حصّہ ہو بہو روسی ناول ”پول پول پوف“ سے ماخوذ ہے۔ آخری افسانے میں جہاں ہیرو کے کپڑے چُرا لیے جاتے ہیں اور وہ شبے میں خود گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ وہ حصّہ

مشہور فرانسیسی شاہکار لافش ڈی فش سے لیا گیا ہے اور چھٹے افسانے میں جب ہیروئن کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور وہ چیخیں مارتی ہوئی جنگل میں جا پہنچتی ہے اور وہاں ایک ریچھ کو ہیرو سمجھ کر اس کے کان کاٹ لیتی ہے۔ یہ ساری کہانی مشہور چینی ادیبہ مس پنگ پانگ کی معرکتہ الآراء کتاب "میاؤں میاؤں" کا ترجمہ ہے۔

قصّہ مختصر ساری کتاب اِدھر اُدھر سے چرائی گئی ہے۔ ہیرو کا حلیہ بیان کرتے وقت مصنّف فرماتے ہیں اس کی عمر ہوگی بیس اور پنتالیس سال کے درمیان۔ بھلا بتایئے تو سہی کہاں بیس اور پنتالیس۔ لاحول ولا قوۃ۔

انسانوں کے پلاٹ بالکل پھسپھسے ہیں۔ جہاں ان کو کسا ہوا ہونا چاہیے تھا وہاں ڈھیلے ہیں اور جہاں ڈھیلا ہونا چاہیے تھا وہاں کس دیے گئے ہیں۔

ایک جگہ لکھا ہے کہ "عین رات کے بارہ بجے میل ٹرین ڈونگہ بونگہ سے چلی اور سیدھی دیولالی جا کر ٹھیری۔" اوّل تو ڈونگہ بونگہ لائن پر کوئی میل ٹرین نہیں چلتی۔ دوسرے یہ کہ ڈونگہ بونگہ نارتھ وسٹرن ریلوے میں ہے اور دیولالی جی آئی پی میں اور پھر رات کے بارہ بجے ڈونگہ بونگہ کے سٹیشن پر نہ کوئی ٹرین آتی ہے اور نہ وہاں سے کہیں جاتی ہے۔ اسی طرح مصنّف نے سردی کے موسم میں

آم کھائے ہیں اور گرمیوں میں کپاس کی کھیت دیکھے ہیں۔ پہاڑوں پر کھجور کے درختوں کا ذکر ہے اور ریگستانوں میں آبشاروں کا۔

سچ مچ ہمیں یہ کتاب پڑھ کر بڑی وحشت ہوئی۔

اگر مصنّف کی یہ پہلی کتاب ہے تو انہیں صبر کر لینا چاہئے۔ اگر دوسری ہے تو حفاظت سے کام لینا چاہیے۔ اگر تیسری یا چوتھی ہے تو ان کی حالت پر افسوس ہے۔

ہم اب تک نہیں سمجھ سکے کہ آخر شتر بے مہاری صاحب نے یہ افسانے لکھے کیوں؟ اگر لکھے بھی تو کتابی صورت میں کیوں ترتیب دیئے۔ اور یہ کتاب انہوں نے کیوں چھپوا دی۔ شتر صاحب اس دنیا میں آئے کیوں۔ شتر صاحب اب تک زندہ کس لیے ہیں۔ کچھ اس قسم کا تھا وہ ریویو۔

آج ہم ایک ریویو لکھ رہے تھے۔ ہم نے اس پر بڑی محنت کی تھی۔ اتنے میں ایک پبلشر صاحب تشریف لے آئے۔ ہم نے ریویو پڑھ کر سنایا۔ وہ بہت خوش ہوئے بولے کس کتاب کا ریویو ہے۔ ہم نے کتاب کا نام بتایا۔ بولے اس نام کی تو کوئی کتاب آج تک نہیں چھپی۔ ہم نے کہا آپ ہی تو چھاپ رہے ہیں۔ وہ صاف مکر گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہم یونہی ایک فرضی کتاب پر ریویو کر گئے تھے۔ کتنی

عجیب بات ہے۔ لیکن ریویو کرنے والوں کو اس قسم کے واقعات سے اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ خیر! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ریویو کرنا ایک زبردست آرٹ ہے اور اس کے بغیر ادب میں ترقّی ناممکن ہے۔ اور اس کے بیشمار فوائد ہیں، دیکھئے نا۔۔۔اچھا! خیر جانے دیجئے۔

ریڈیو

اس شام کو عجب تماشا ہوا۔ جب میں کھیل کود کر تھکا ہوا واپس آیا تو غلطی سے ریڈیو کے پاس جا بیٹھا۔ پروگرام پڑھا تو جی للچا اٹھا۔ ایک سٹیشن سے ایک بوڑھے تجربہ کار شکاری اپنی زندگی کے حالات سنا رہے تھے۔ دوسرے سٹیشن سے ایک فلمی ہیرو صاحب مدظلہ، اپنی رومان انگیز زندگی پر روشنی ڈال رہے تھے۔ اور تیسرے سٹیشن سے ایک ماہرِ طفیلات، بزرگ، بچّوں کی نفسیات او تعلیم و تربیت پر تقریر فرما رہے تھے۔

تینوں پروگرام ایک ہی وقت شروع ہونے والے تھے۔ اب دل میں رسہ کشی شروع ہو گئی۔ پھر سوچا کہ بچّوں سے ہمارا کیا واسطہ ؟ وہ اپنی نفسیات اپنے پاس رکھیں۔ یہاں اپنی نفسیات سنبھالی نہیں سنبھلتیں۔ اب رہی وہ ایکٹر صاحب کی داستانِ حُسن و عشق، اُسے سُن کر خواہ مخواہ رشک آئے گا۔ بہتر یہی ہے کہ شکاری صاحب کی باتیں سُنی جائیں۔ بندوق تو ہمیں بھی چلانی آتی ہے۔

نہ جانے کیا مصیبت تھی وہ سٹیشن ہی نہ ملتا تھا۔ عجیب عجیب آوازیں آ رہی تھیں۔ قوّالیاں ہو رہی تھیں۔ کتّے بھونک رہے تھے۔ سیٹیاں بج رہی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے۔ لیکن وہ سٹیشن ہی نہیں لگتا۔ کچھ ایسا موسم بھی خراب نہ تھا۔ سوچا شاید ریڈیو بگڑ گیا ہے۔ آخر تنگ آ کر رستم میاں کو بلایا۔ یہ ہمارے پرانے ملازم تھے اور ریڈیو کے عاشق تھے۔ ریڈیوں ان کے سپرد کر کے میں صوفے پر لیٹ گیا۔ رستم کو وہ اسٹیشن فوراً مل گیا۔ شکاری صاحب تقریر شروع کر چکے تھے۔ آواز آئی۔

ہاتھی کا شکار بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ہاتھی سپورٹس مین بالکل نہیں ہوتا۔ ہاتھی ایک کینہ پرور، کینہ خور، کینہ جو اور کینہ نواز اور کچھ کمینہ سا جانور ہے۔ اگر کوئی ہاتھی سن رہا ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ اگر ہاتھی ایسا نامعقول نہ ہوتا تو شکاریوں سے اتنی سی بات پر لڑتا جھگڑتا کیوں۔ دیکھئے نا شکاری فقط اسے مار ڈالنا ہی چاہتے ہیں نا اور تو کچھ نہیں چاہتے۔ اور اتنی سی بات کے لیے اتنا بغض رکھنا، بدلے لینا، یہ کرنا، وہ کرنا۔ یہ سب باتیں ہاتھی کو انسانیت سے گرا دیتی ہیں۔ اور جانوروں کو دیکھئے شکاریوں سے کتنی اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ دسمبر سنہ بیس کا ذکر ہے۔ ۱۵ تاریخ تھی۔ اور یہی رات کے کوئی گیارہ بجے تھے۔ میں جنگل میں بیٹھا ایک ہاتھی کا انتظار کر رہا تھا۔ کمبخت نے بڑا پریشان کیا۔ آخر رات کے دو بجے آیا۔ اکیلا نہیں ایک اور ہاتھی کو بھی ساتھ لے آیا۔ میں نے

گولی چلائی۔ میرے تعجب کی کوئی حد نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ گولی فقط ایک ہاتھی کو لگی دونوں ہاتھیوں کو نہیں لگی۔ ایک ہاتھی وہیں بیٹھ گیا۔ دوسرا میری طرف لپکا۔ اگلے روز مجھے پتہ چلا کہ وہ ہتھنی تھی۔۔۔یعنی مسز ہاتھی۔ خیر تو ہتھنی نے اپنے سونڈ سے درخت کی کئی ٹہنیاں توڑ دیں اور مجھے بھی نیچے پٹخ دیا۔ غالباً میں یہ بتانا ہی بھول گیا کہ میں ایک درخت پر بیٹھا تھا۔ میں گرتے ہی اُچھلا اور اُچھلتے ہی پھر گرا۔ پھر اُٹھا، جلدی سے گرا اور اُٹھا اور بھاگا۔ ہتھنی نے تعاقب کیا۔ کوئی پندرہ میل تک بھاگتا رہا۔۔۔ ٹھہریے پندرہ نہیں۔ یہی کوئی دو تین میل بھاگا ہوں گا۔ اتنے میں مجھے موقع مل گیا اور ہتھنی کو چکر دیے کر میں ایک اونچے درخت پر چڑھ گیا۔ ہتھنی نے منٹوں میں اس درخت کو بھی گرا لیا۔ میں زندگی سے بالکل ناامید ہو چکا تھا اور آخری حملے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے ہتھنی کے سامنے کھڑے ہو کر نشانہ باندھا اور گھوڑا دبا دیا۔ بندوق کا گھوڑا۔ میں گھوڑے پر سوار نہیں تھا۔ زمین پر کھڑا تھا۔ گھُورا تو دبا دیا۔ لیکن بندوق سے کچھ بھی نہ نکلا۔ اندر کارتوس ہوتا تو کچھ نکلتا بھی۔ اب ہتھنی سونڈ اُٹھا کر چنگھاڑتی ہوئی مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے۔۔۔۔ لیکن پھر میں نے کیا کیا؟ مَیں نے ہمت کر کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور آنکھوں سے لگا کر کہا اگر تمہیں میری زندگی سے نکال دیا جائے تو میری زندگی بالکل ویران ہو جائے گی۔۔۔ بالکل اُجاڑ رہ جائے گی۔ تمہارے دم سے میری ظلمتیں منوّر ہیں

۔ تمہاری ہی یہ ساری چہل پہل ہے۔ وہ کچھ مسکرائی اور میں غش کھاتے کھاتے بچا۔ مَیں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں رکھا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ فقط ایک اُلو تھا جو اپنی پیاری اور سریلی آواز سے اس خاموشی کو توڑ رہا تھا۔ ہمارے سر پر تاروں کی چھت تھی اور پاؤں کے نیچے زمین تھی۔ ہمارے سامنے مشرق تھا۔ پیٹھ پیچھے مغرب۔ دہنے بازو جنوب اور بائیں ہاتھ شمال۔ ایسی رومان انگیز فضا میں مَیں نے اظہارِ محبّت کیا۔ اور اس نے مُسکرا کر گردن جھکالی۔

جب دِل کی دھڑکن ذرا دُور ہوئی تو میں نے اس کا ہاتھ پھر اپنی آنکھوں سے لگالیا۔ غالباً میں نے یہ نہیں بتایا کہ مَیں نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ یکلخت دل نے کہا کہ ہمّت کرو اور آج ہی زندگی بھر کے لیے پیمانِ وفا باندھ لو۔۔۔۔ کیا تم میری ایک التجا مانو گی؟ اُس نے اثبات کے طور پر سر ہلا دیا۔۔۔ میں اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور چلّا کر بولا۔ دیکھو میں تمہیں آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ اگر تم اسکول نہیں گئی تو یقیناً پِٹ جاؤ گی۔ ایسی ضدّی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ آنے دو تمہاری امّی کو۔ دیکھو تمہاری کیسی گت بنواتا ہوں۔ اِدھر اس نے مچلنا شروع کر دیا۔ پہلے تو صرف مچلتی رہی پھر ٹھنکنا اور باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ بہتر امنایا۔ مٹھائی کے وعدے کئے۔ سینما کا لالچ دیا۔ بہتری منّت سماجت کی لیکن اس کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔ یہ بچّے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ان سے

ذرا شرافت سے پیش آؤ تو اکڑ جاتے ہیں۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ ان میں رشک کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے پڑوس کے ایک بچّے کی تعریفیں شروع کر دیں۔ میں نے کہا ذرا منّو کو تو دیکھو۔ کتنا پیارا بچّہ ہے۔ کبھی آج تک ضد نہیں کی نہ کبھی تمہاری طرح روتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُسے پیٹ بھی دو تو بھی نہیں روئے گا۔ تم سے وہ لاکھ درجے اچھا ہے۔ اس کی عادتیں نہیں دیکھیں تم نے کتنی اچھی اور سدھری ہوئی ہیں۔ اس کی ہر ایک بات سے یہ صاف عیاں ہے کہ وہ سب سے مختلف ہے۔ وہ ہمیشہ علی الصبح اُٹھتا ہے۔ ابھی اندھیرا ہی ہوتا ہے کہ وہ پانی پینے جاتا ہے۔ پانی پی کر زور سے ڈکارتا ہے۔ اور سارا جنگل گونجنے لگتا ہے۔ چرند، پرند، درند سب جاگ اُٹھتے ہیں۔ اس کے بعد شیر شکار کھیلنے نکل جاتا ہے۔ دوپہر کو بیوی بچّوں کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر قیلولہ کرتا ہے۔ شام کو شیر کھیل کھیلتا ہے یا کسی دوسرے جنگل کے شیر کے ہاں ملنے چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات دوسرے جنگلوں کے شیر اپنے کنبوں کے ساتھ اس کے ہاں آ جاتے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد شیر کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں جنگل کا ہر جانور شرکت کرتا ہے۔ اس وقت شیر اگلی صبح کے شکار کے لیے چند اچھے جانور منتخب کر لیتا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے شیر ایک مرتبہ پانی پینے ضرور جاتا ہے۔ دراصل شیر کو پیاس بہت لگتی ہے۔ شیر کو شکار کرنے کا بہترین وقت وہ ہے جب وہ پانی پینے جا رہا ہو۔ جب وہ پانی پینے کا ارادہ

رکھتا ہو اور یہ ظاہر کر دے کہ اسے پیاس لگی ہے تو یہی کوشش کرنی چاہیئے کہ اسے دودھ پلایا جائے۔ اسے حتیٰ الوسع پانی نہ دیا جائے۔ کیونکہ اسطرح اس کے معدے پر بُرا اثر پڑے گا۔ دودھ میں شکر کم ہونی چاہیے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ بغیر شکر کا دودھ سب سے اچھا ہے کئی لوگ بچّوں کو یخنی پلاتے ہیں۔ مَیں اس کے سخت خلاف ہوں۔ مَیں نے آج تک بچّوں کو کوئی ثقیل چیز نہیں پلائی۔ ایک بات اور ہے، وہ یہ کہ دودھ پیتے وقت بچّے کا دھیان کسی اور طرف ہونا چاہیے۔ مثلاً ریڈیو بج رہا ہو۔ ریڈیوں پر کوئی تقریر ہی ہو رہی ہو یا پکا راگ ہو رہا ہو۔ (بچّے پکّے راگوں کو بیحد پسند کرتے ہیں اور تقریریں سُن کر وہ بہت محفوظ ہوتے ہی)۔ قصّہ مختصر اگر موسیقی ہو تو بہت اچھا ہے۔ کیونکہ رومان اور موسیقی کا آپس میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ خاص طور پر اظہارِ محبّت کے وقت اگر خوش قسمتی سے آس پاس کوئی گا رہا ہو یا سِتار بجا رہا ہو تو بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ اگر بالکل نزدیک کھڑا ڈھول بجا رہا ہو تو خوش نصیبی ہے۔۔۔۔ موسیقی کی سفارش سے اکثر دیکھا گیا ہے کہ التجائے محبّت قبول ہو جاتی ہے۔ مجھے وہ رات نہیں بھولتی جب میں نے ایک سنگدل کے قدموں پر اپنا دل رکھ دیا تھا۔ وہ رات کتنی پیاری تھی، کتنی دلفریب تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف چند جھینگر گا رہے تھے۔ ورنہ ہُو کا عالم تھا۔۔۔ میں بالکل خاموش تھا۔ اتنے میں آہٹ ہوئی اور چند بندر بڑی تیزی کے ساتھ میرے سامنے سے گزر گئے۔ دفعتاً میں نے ایک سایہ دیکھا جو میری

طرف آرہا تھا۔ یہ ایک ریچھ تھا۔ میں نے بندوق سنبھالی اور سانس روک کر بیٹھ گیا۔ لیکن ریچھ نے عقلمندی اور دوراندیشی سے کام لیا اور راستہ تبدیل کر لیا۔ اتنے میں ایک بھیڑیا میرے پاس آکھڑا ہوُا۔ جسے مَیں نے ہشت کہہ کر بھگانا چاہا۔ وہ نہ بھاگا۔ پھر اسے ڈرایا دھمکایا لیکن وہ وہاں سے بالکل نہ ہلا اور سامنے کھڑا مجھے گھورنے لگا۔ آخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے زور سے پانچوں انگلیوں کا وہ تھپڑ دیا۔۔۔۔ مُنہ پر کہ طبیعت صاف ہو گئی۔ تھپڑ لگنا تھا کہ اس نے بڑے زور سے رونا شروع کر دیا۔ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں بہت گھبرایا۔ کیونکہ اس کی چیخ و پکار سے سارا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ جب وہ بلک بِلک کر رو رہا تھا تو مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ بچّے کو مارنا نہیں چاہیے۔ نرمی سے سمجھانا چاہیے۔ محبّت اور پیار سے۔ اگر اسے چمکار کے کوئی بات کہی جائے تو وہ فوراً مان جاتا ہے۔ محبّت کی بدولت ناممکن کام بھی ممکن کا ممکن ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ محبّت تو سب سے بڑا جادو ہے۔ لیکن ہمت کبھی نہیں ہارنی چاہیے۔ اپنی قسمت سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ بڑے اطمیان اور سکون سے محبّت کرنی چاہیے۔

میں خود بارہا آزما چکا ہوں، خودداری وہ چیز ہے جس کی محبّت میں اشد ضرورت ہے، اور یہ بھی سو فیصدی سچ ہے کہ سچّے دِل وسے کی ہوئی محبّت کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہوں۔ اگر واقعی آپ مذاق سمجھ رہے ہیں تو بڑا افسوس ہے۔۔۔۔ آپ یقین کیجئے یہ بیحد سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اس پر

ایک معصوم زندگی کا انحصار ہے۔ بھلا خوراک اچھی نہ ملے تو تربیت کیا خاک ہو گی؟ آپ کا فرض ہے کہ بچّے کی پوری پوری نگہداشت کریں۔ اس کی خوراک کا خاص خیال رکھیں۔ نوکروں پر ہرگز اعتبار نہ کریں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایک نوکر چند ماہ کے بچّے کو قیمہ اور پراٹھے کھلا رہا تھا۔ اور بچّہ مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ ایک دوسرے نوکر نے دودھ پیتے بچّے کو سالم مرغ بھون کر کھلا دیا۔ نوکر ہمیشہ بے احتیاطی کرتے ہیں اور بچّوں معاملہ بڑا نازک ہے۔۔۔ ذراسی بے احتیاطی سے سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا ہے۔ نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ زنگ لگ جاتا ہے۔ شکل بگڑ جاتی ہے۔ حلیہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر بے احتیاطی سے بندوق کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ اس لیے بندوق کو ہفتے کے ہفتے صاف کرنا چاہیے۔ بہتر ہو گا کہ آپ یہ کام خود کریں۔ سب سے پہلے آپ بندوق کو بالکل خالی کر لیں۔ کیونکہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کارتوس اندر رہ گئے اور چل پڑے۔ ایسے کئی حادثے ہو چکے ہیں۔ اِس کے بعد پھر خالص بندوق کے تیل کی مالش کریں۔۔۔۔ اور غور سے دیکھتے جائیں کہ کہیں چھوٹا موٹا سا سوراخ تو نہیں یا کہیں سے ٹوٹ پھوٹ تو نہیں گئی۔ کیونکہ اگر ذرا سا سوراخ ہوا تو دودھ باہر نکل جائے گا اور بچّہ بھوکا رہ جائے گا۔ ویسے دودھ پلانے کی یہ بوتل اپنا جواب آپ ہی ہے۔ اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بچّہ جب چاہے دودھ پی سکتا ہے اور جب چاہے انکار کر سکتا ہے۔ بوتل کے ساتھ ایک پرچہ بھی

ملتا ہے جس میں ہدایات ہوتی ہیں۔ میں آپ کی سہولت کے لیے ہدایات پڑھے دیتا ہوں۔ سنئے، جب بچّہ ایک مرتبہ دودھ پی چکے تو اسے گرم پانی میں ڈال دیجئے (بوتل کو)۔ اور جب بچّہ دو تین روز بوتل کو استعمال کر چکے تو اسے کھولتے ہوئے پانی میں اچھی طرح اُبالا جائے اور تمام پیسوں کو علیحدہ علیحدہ رکھ دیا جائے (بوتل کے حصّوں کو) اور بچّہ کو دودھ پلاتے وقت اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہیے (بچے کے سر پر) اور ہر روز استعمال سے پہلے اسے دھوپ میں سکھا کر صاف کر لینا چاہیے (بوتل کو) بچّے کو بہلا پھسلا کر اور چمکار چمکار کر دودھ پلانا چاہیے اور یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اگر آپ نے بچّے کو ایک مرتبہ بھی دھمکا دیا تو اس کے دل میں نہ صرف آپ کا ڈر بیٹھ جائے گا بلکہ بوتل کا بھی اور ممکن ہے وہ ایک دن بڑا ہو کر آپ ہی کو دھمکا دے۔ میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ بچّے کو اپنے پاس بٹھا لیں۔ پہلے اسے گدگدائیں۔ اس کی ہتھیلیوں اور تلووں میں گُدگُدی کریں، جب وہ ہنسنے لگے تو اسے اور بھی گدگدائیں اور پھر اسے خوب پیار کریں۔۔۔۔ اس کے بعد اس کی گود میں سر رکھ کر اپنے دل کا راز کہہ دیں۔ اور یہ شعر ضرور پڑھیں ۔

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر

جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

اور پھر بڑے موثر لہجے میں کہیں کہ اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو میں خودکشی کر لوں گا یا اپنے آپ کو مار ڈالوں گا۔ یہ سب تمہاری محبّت کا قصور ہے۔ میرا قصور ہرگز نہیں۔ میری آنکھوں کا قصور ہے۔۔۔۔ یہاں آپ ضبط سے کام لیں۔ اگر آپ نے وہ شعر۔

آنکھوں کا تھا قصور چھُری دل پہ چل گئی

پڑھ دیا تو سارا کیا کرایا مٹّی میں مِل جائے گا۔ جواب کا انتظار ضرور کریں۔ ممکن ہے کہ جواب میں دیر ہو جائے۔ لیکن جواب ضرور ملیگا۔۔۔ جواب ہمیشہ ملتا ہے۔ مختلف جانور مختلف طریقوں سے جواب دیتے ہیں۔ ریچھ چھیڑ کر جواب تھپڑ سے دیتا ہے۔ شیر کو چھیڑو فوراً کاٹ کھائے گا۔ اُونٹ کچھ نہیں کہتا مُسکرا کر معاف کر دیتا ہے۔ ہاتھی اپنی سونڈ سے زور کا چابک رسید کرتا ہے کہ چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ چیتا اپنی دُم سے گدگدیاں کرنے لگتا ہے۔ گینڈا تو پہلے سوچتا ہے پھر یکلخت نزدیک آ کر ایک زبردست دُلتّی مارتا ہے۔ دریائی بکرا چھیڑ کا جواب چھیڑ سے دیتا ہے۔۔۔ لیکن جواب ضرور ملتا ہے۔ جواب جواب میں بھی فرق ہے اور اگر محبّت کا جواب محبّت سے نہ ملے تو زندگی بے کار ہے اس صورت میں انسان کو فوراً مر جانا چاہیے۔ اگر وہ خود نہ مر سکے تو خودکشی کر لینی چاہیے۔ خودکشی نہایت اچھی چیز ہے۔ صحت کے لیے مفید ہے۔ میں خود پانچ چھ مرتبہ

خودکشی کر چکا ہوں۔ معاف کیجئے میرا مطلب ہے کہ خودکشی کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ خودکشی کی کوشش کرنا بھی خودکشی کے برابر ہے۔ دونوں کا ایک سا درجہ ہے۔ ایک سی عزّت ہے۔ اور ایک سا ثواب ہے۔۔۔۔۔ کھڑڑ کھرڑ۔۔۔ شوں۔۔۔۔ چٹاخ۔۔۔۔ چُوں چُوں۔۔۔۔ میاں مٹھو ہوں۔۔۔۔۔ گھڑڑ۔۔۔ نمک دو روپے چھٹانک۔۔۔۔۔ گیہوں ساڑھے پندرہ آنے سیر۔ ماش پونے دو روپے من۔ بیلوں کی جوڑی ستّر روپے۔ ہاتھیوں کی جوڑی چار سو روپے کی۔ بندروں کی جوڑی مفت اور اُلّووں کی جوڑی بالکل مفت۔۔۔۔۔۔۔ ارے پنگھٹ پہ نند لال چھیڑ گیو ری۔۔۔۔۔۔۔ موہے چھیڑ گیو ری۔۔۔۔۔ سے ماما ناری گیوری۔۔۔۔ واسکوڈی گاما پادھانی سا گیوری۔۔۔۔۔۔

آج چھٹے مہینے کی چھٹی تاریخ ہے اور اس وقت چھ بجکر چھ منٹ ہیں۔ آپ فارسی میں خبریں سنئے یا چلئے رہنے دیجئے۔ کل دہلی میں پانچ منٹ بارش ہوئی تھی۔ جس سے ملتان میں بڑی خوشیاں منائی جارہی ہیں۔۔۔۔ کھڑڑ۔۔۔۔ کھڑڑ۔۔۔۔

میں ہڑبڑا کر اٹھا اور ریڈیو بند کر دیا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کیا چیز تھی میں نے ابھی ابھی سُنی۔ رستم میاں قسمیں کھا رہے تھے کہ وہ ریڈیو کے پاس بیٹھے ضرور تھے لیکن انہوں نے اُسے چھیڑا بالکل نہیں۔ اور یہ ساری شرارت ریڈیو کی تھی۔

مان نہ مان

کردار

زینت	اسلم کی بیوی
اسلم	زینت کے میاں
لطیف	اسلم کا دوست
نبّو	اسلم کا نوکر

ایک ریڈیو اور ایک ٹیلیفون

پہلا سین

(ایک کمرہ۔۔۔ جیسے اکثر لوگوں کی کوٹھیوں میں اکثر ہوُا کرتے ہیں)

ایک طرف ریڈیو رکھا ہے ساتھ ہی ایک کرسی پر زینت بیٹھی ریڈیو سُن رہی ہے۔ پہلے کسی ریکارڈ کا آخری حصّہ بجتا ہے پھر۔۔۔

"یہ لاہور تھا۔ میرا مطلب ہے، یہ لاہور ہے۔ ابھی آپ نے فلم خوفناک پھلجڑی کے ریکارڈ سُنے، اب شام کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ اب ہمارا عورتوں کا پروگرام شروع ہوتا ہے۔ یعنی اگر مرد چاہیں تو بے شک نہ سُنیں۔ پہلے آپ کو مسز حسرت ہاشمی اپنی تقریر پڑھ کر سنائیں گی۔ جس کے متعلق ان کا اصرار ہے کہ یہ ان کی اپنی لکھی ہوئی ہے۔ اور قدرے طبع زار بھی ہے۔ اس سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ انہوں نے کہیں سے چرائی ہے یا اُن کے میاں نے لکھ کر دی ہے۔ خدا کرے یہ اُنہوں نے خود لکھی ہو۔ عنوان ہے عورت اور فیشن۔۔۔ نہیں نہیں۔۔ فیشن اور عورت۔۔۔۔ ویسے بات ایک ہی ہے۔ آیئے مسز حسرت ہاشمی۔"

مسز حسرت ہاشمی: خواتین و حضرات۔۔۔ اوہ معاف کیجیے۔۔۔ صرف خواتین! ہاں تو پیاری بہنو! میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ یہ مردخواہ

ایورسٹ پر چڑھ جائیں۔ سمندر کی تہہ میں چہل قدمی کریں
یا کوئی اور اسی قسم کا بے تُکا کام کر بیٹھیں، لیکن یہ ہر گز نہ پتہ
چلا سکیں سکیں گے کہ عورت فیشن کی غلام ہے، یا فیشن
عورت کا۔۔۔۔!

(ایک موٹر کے آنے اور رُکنے کی آواز کار کا دروازہ کھلتا اور بند ہوتا ہے اور باہر
سے قدموں کی چاپ)

زینت: (آواز دے کر) نبّو! جاؤ دیکھو شاید صاحب آئے ہیں۔

نبّو: (دوسرے کمرے سے) بہت اچھا سرکار۔

مسز حسرت ہاشمی: بہر حال اس سے تو کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ بننے سنورنے
کا مادہ عورت کی فطرت میں داخل ہے۔ اسے ہر وقت یہی
خیال رہتا ہے کہ آج کون سی خوشبو لگائی جائے۔ کون سا
لباس پہنا جائے۔ کس قسم کے بال بنائے جائیں اور۔۔۔۔۔

(اسلم داخل ہوتا ہے، دفتر سے تھکاماندہ گھر آیا ہے اس لیے مزاج ذرا چڑچڑا
ہے)

اسلم: یہ کیا بیکار باتیں سُن رہی ہو؟

زینت: لاہور سے عورتوں کا پروگرام ہو رہا ہے۔

اسلم: بھلا یہ بھی کوئی سُننے کی چیز ہے؟

زینت: عورتوں کا پروگرام عورتیں ہی سُنا کرتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس وقت میری ایک سہیلی تقریر پڑھ رہی ہیں۔

اسلم: اخّاہ! تو یہ محترمہ تمہاری سہیلی ہیں، سچ پوچھو تو تمہاری سہیلیوں نے بھی عاجز کر دیا، پہلے یہاں آ کر آئیں بائیں شائیں سُنایا کرتی تھیں اور اب وہ ریڈیو کے ذریعے دُنیا کو سُنانے لگیں۔

زینت: الٰہی خیر! ـــــ خود تو چاہے سارا دن ریڈیو پر دنیا بھر کی فضول خبریں سُنا کرو۔ نگوڑا کرکٹ کا میچ، ٹینس کا میچ۔ کھیل کوئی رہا ہے اور بے تاب کوئی اور ہو رہا ہے۔ ادھر میں نے ذرا سی کام کی بات سُننے کے لیے ریڈیو کھولا اور جناب ناراض ہونے لگے۔

اسلم: اچھا بتاؤ اس وقت کونسی کام کی بات ہو رہی ہے؟

زینت: اس پروگرام میں اکثر ایسی مفید باتیں سنائی جاتی ہیں جو ہر کسی کو معلوم نہیں۔ آج بات کیا ہے؟ بات بات پر بگڑتے کیوں جا رہے ہو؟

اسلم: سر میں سخت درد ہے۔

زینت: جب ہی تو، میں کہوں یہ بات کیا ہے کہ آتے ہی برسنے لگے۔

(ریڈیو بند کر دیتی ہے۔ نبّو آتا ہے)

نبّو: صاحب غسل خانے میں گرم پانی لگا دیا ہے۔

اسلم: (غصّے سے ڈانٹ کر) میں نے تجھ سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ میں دفتر سے آتے ہی نہیں بلکہ ٹھیر کر نہاتا ہوں اب پانی پڑا پڑا گرم ہو جائے گا۔

زینت: یعنی پڑا پڑا ٹھنڈا ہو جائے گا۔۔۔۔

اسلم: (زور سے) ہاں ٹھنڈا ہو جائے گا۔

نبّو: جی سرکار!

اسلم: جی سرکار کا بچّہ! جا دفعہ ہو۔

زینت: یہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ مانا کہ تمہارے سر میں درد ہے مگر اس کے معنی یہ تو نہیں کہ بلا وجہ کسی پر ناراض ہونے لگو۔ آخر روز دفتر سے آتے ہی نہاتے ہو۔ نبّو نے کوئی جرم نہیں کیا۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ اسلم ریسیور اٹھاتا ہے)

اسلم: میں اسلم بول رہا ہوں۔۔۔۔ جی؟۔۔۔۔ بلّی!۔۔۔۔۔ کیا کہا بلّیاں۔۔۔۔ اوہ بالائی۔۔۔۔ حلوائی کیا؟۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔ پانچ سیر دودھ اور آدھ سیر بالائی۔۔۔۔۔ ڈیری فارم؟ معاف کیجیے گا یہ ڈیری فارم نہیں ہے۔

(ریسیور پٹخ دیتا ہے)

اسلم: لاحول ولا قوۃ عجب احمق ہے کوئی۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے)

اسلم: (جھنجھلا کر ریسیور اٹھاتا ہے) ہیلو۔۔۔۔ میں ۴۲۰ سے بول رہا ہوں۔ جسے چار سو بیس بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کس نمبر کو بلاتے ہیں؟ کیا کہا آدھ سیر بالائی کا آرڈر اور بڑھا دوں؟۔۔۔۔۔۔ بہت اچھا!

(ریسیور کو دے مارتا ہے)

اسلم: بیگم کل مجھے یاد دلانا۔ اس ٹیلیفون والے کو بھی چٹھی لکھنی ہے۔ ناک میں دم کر دیا۔ ان جاہل غلط نمبر ملانے والوں نے، ابھی کل ہی کوئی

حضرت کسی جانور کی فروخت کے سلسلے میں مشورہ لے رہے تھے۔ اس سے پہلے ایک صاحب نے جوتوں کا آڈر دیا تھا۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے)

اسلم: (دانت پیس کر) اوہ میرا سر۔ اب کے میں ضرور کچھ سُنا دوں گا۔ (رسیور اٹھا کر) سنیے صاحب۔۔۔۔ اگر آپ کے بزرگوں نے ٹیلیفون استعمال نہیں کیا تو آپ کیوں کرتے ہیں؟۔۔۔ اگر آپ کو نمبر ملانا نہیں آتا تو پہلے سیکھ کر آیئے۔۔۔ سمجھے۔۔۔؟ بس! بھاگ جاؤ۔۔ ہیں؟ کون بول رہا ہے۔۔۔؟ لا حول ولا قوۃ! یار معاف کرنا! ابھی کسی مسخرے نے تین چار دفعہ غلط نمبر نمبر ملایا، میں سمجھا تم وہی مسخرے ہو؟۔۔۔ اچھا سناؤ یار کب آئے؟۔۔ اسی ٹرین سے؟ اب کہاں ہو؟۔۔۔ سٹیشن پر؟ کیا کہا، یہاں آ رہے ہو؟ ہاں آج کل کوئی مہمان نہیں، مہمانوں والا کمرہ خالی پڑا ہے۔ تو کب پہنچ رہے ہو؟ پندرہ منٹ میں؟ اچھا تو پھر فوراً آؤ۔ زیادہ انتظار نہ کرانا۔۔۔۔ وعلیکم السلام۔

(ریسیور رکھ دیتا ہے)

اسلم: بیگم ایک تازہ ترین مصیبت آ رہی ہے۔

زینت: کیا ہوا۔۔۔ یہ کون صاحب تھے فون پر؟

اسلم: لطیف صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

زنیت: خدا خیر کرے۔ کہیں اب کے بھی وہ دو مہینے ٹھیر گئے تو میں حسبِ معمول پاگل ہو جاؤ نگی۔ اگر میں تمہارے دوستوں میں سے کسی سے گھبر اتی ہوں تو اِن لطیف صاحب سے۔

اسلم: بیگم کیا بتاؤں تمہارا سابقہ تو ان سے ایک دو مرتبہ ہی پڑا ہے۔ سب دوست ان سے بھاگتے ہیں، کچھ نہ پوچھو۔ اس قدر خشک آدمی واقع ہوا ہے کہ کیا بتاؤں۔۔۔۔ اور اس پر نام قبلہ کا لطیف ہے۔

زینت: کثیف ہونا چاہیے ایسے شخص کا نام۔

اسلم: اور پھر ان کی باتیں؟۔۔۔ اللہ کی پناہ۔

زینت: پچھلی مرتبہ جب تشریف لائے تھے تو سوائے اپنی متعلق باتیں کرنے کے ان کے مُنہ سے کوئی اور ذکر ہی یہ سُنا۔ دماغ چاٹ گئے۔ عجیب باتونی انسان ہیں۔ آپ نے کبھی انہیں ٹوکا بھی نہیں کیا؟

اسلم: ٹوکا۔۔۔ اونھ! یہ بھی ایک ہی کہی بیگم۔ بیسیوں مرتبہ ٹوکا۔ سینکڑوں دفعہ اشارے کئے مگر وہ اللہ کا بندہ چُپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ہر بات میں دخل۔ کوئی بلائے نہ بلائے لطیف صاحب ہر دعوت میں دھرے ہوئے ہیں۔

زینت: تو گویا مان نہ مان میں تیرا مہمان۔

اسلم: جی! اور اوپر سے طرّہ یہ کی کہ حضرت جو کام کرتے ہیں وہ دوسروں پر احسان جتا کر۔

زینت: یعنی اب جو یہاں تشریف لا رہے ہیں تو گویا اُلٹا ہم پر احسان کر رہے ہیں؟

اسلم: جی اس کا بھی کوئی جواب ہے آپ کے پاس۔

زینت: ہے تو نہیں لیکن گھڑا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ کوئی ترکیب ایسی سوجھی جائے کہ جناب کو یہاں قیام کرنا مشکل ہو جائے۔

اسلم: ہاں خیال تو معقول ہے مگر وقت اتنا تھوڑا ہے کہ۔۔۔

زینت: وقت کی فکر نہ کرو۔ اگر انسان چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچو تو سہی۔۔۔۔۔

(ایک وقفہ)

اسلم: (خوشی سے اچھل کر) سوچ لی، سوچ لی۔ بھئی خوب سوجھی اسلم۔

زینت: کیا سوچ لی؟

اسلم: (سر ہلا کر) نہیں۔۔۔۔ کچھ نہیں۔

اسلم: (کچھ دیر کے بعد پھر اُچھل کر) اس مرتبہ سوچ لی۔

زینت: کیا سوچا؟ جلد کہو۔

اسلم: سنو۔ اور ذرا کان کھول کر سنو۔

زینت: کچھ کہو بھی یا۔۔۔۔

اسلم: کچھ صبر سے سنو گی بھی یا؟۔۔۔۔ دیکھو میرے خیال میں لطیف صاحب کو یہاں سے دور بھگا دیا جائے۔

زینت: مگر کیسے؟

اسلم: تم نہیں جانتیں لطیف کس قدر ڈرپوک انسان واقع ہوا ہے۔

زینت: تو پھر؟

اسلم: تو پھر بس ڈرا دیا جائے۔

زینت: لیکن کوئی چُوک نہیں ہونی چاہیے ورنہ لطیف صاحب اپنا کُوچ ملتوی کر کے یہیں ڈیرے ڈال دیں گے۔

اسلم: تم بے فکر ہو۔ نبّو کو بلاتے ہیں۔ اسے بھی اس نیک کام میں شریک کرتے ہیں۔ اے نبّو! (آواز دیتا ہے)

نبّو: (دوسرے کمرے سے) جی حضور!

(نبّو آتا ہے)

نبّو: سرکار آپ نے یاد فرمایا ہے؟

اسلم: نبّو تمہیں لطیف صاحب یاد ہیں؟

نبّو: حضور کے دوست جو پچھلی مرتب دو مہینے ٹھیرے تھے؟

اسلم: ہاں ہاں وہی، وہ صاحب اب پھر یہاں آ رہے ہیں۔

نبّو: تو کیا وہ پھر یہاں دو مہینے ٹھیریں گے ؟

اسلم: کیوں ؟ تم نے تو اس طرح کہا جیسے تمہیں ان کا یہاں ٹھیرنا پسند نہ ہو۔

نبّو: حضور میری پسند ناپسند کیا چیز ہے۔ میں تو حضور کا ملازم ہوں۔ نمک کھاتا ہوں۔

اسلم: ہاں ہاں وہ تو ٹھیک ہے، نمک کھاتے ہو، مرچ بھی کھاتے ہو۔ مگر تم انسان بھی تو ہو، حق رکھتے ہو کسی کو پسند یا ناپسند کرنے کا، بولو ہو نا انسان ؟

نبّو: جی کچھ ہوں ہی۔

اسلم: اچھا بتاؤ لطیف صاحب سے تم کو کیا شکایت ہے ؟

نبّو: جناب میں کیا بتاؤں۔ انہوں نے تو پچھلی مرتبہ جان ہی نکال لی تھی۔

اسلم: وہ کیسے ؟

نبّو: حضور وہ تو ذرا ذرا سی بات پر اس طرح ڈانٹ دیا کرتے تھے کہ آپ نے بھی کبھی نہیں ڈانٹا۔ اور۔۔۔۔۔

اسلم: اچھا اچھا ہم سمجھ گئے، ایک کام کرو گے ؟

نبّو: حضور فرمائیں۔

اسلم: نبّو ہم نہیں چاہتے کہ لطیف صاحب ایک رات سے زیادہ یہاں قیام فرمائیں تم ہوشیار آدمی ہو۔ تمہیں صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ لطیف صاحب ذرا ڈرپوک واقع ہوئے ہیں۔ سمجھ گئے ؟

نبّو: سمجھ گیا حضور۔ آپ کا یہی مقصد ہے نا کہ لطیف صاحب یہاں سے یوں غائب ہو جائیں جسے گدھا سینگوں کے نیچے سے نکل جائے۔

اسلم: گدھا سینگوں کے نیچے سے نکل جائے ؟ کیا مطلب ہوا؟؟

نبّو: یعنی اس طرح غائب ہو جائیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

اسلم: بالکل! اگر تم انہیں بھگانے میں کامیاب ہو گئے تو ہم تمہیں انعام دیں گے۔ اب جاؤ۔

(نبّو جاتا ہے)

اسلم: میرے سر کا درد کم ہو گیا ہے۔۔۔ ذرا نہالوں۔

زینت: ہاں ہاں جایئے۔

(اسلم جاتا ہے)

(باہر موٹر کے آنے اور رُکنے کی آواز)

زینت: (آواز دیتے ہوئے) نبّو نبّو۔ باہر لطیف صاحب آئے ہیں۔ شاید! جاؤ اندر لے آؤ۔

(لطیف آتا ہے)

زینت: آیئے لطیف صاحب! مزاج شریف۔

لطیف: آداب عرض ہے۔ مسز اسلم! سنایئے!! اسلم کہاں ہیں؟

زینت: وہ نہار رہے ہیں۔ تشریف رکھئے۔

لطیف: ذرا سامان رکھوا لوں۔ ویسے تکلّف کی تو کوئی بات ہی نہیں، اپنا گھر ہے۔

زینت: بے شک بھلا اپنے گھر میں بھی کوئی تکلّف کرتا ہے۔

لطیف: آپ تو جانتی ہیں مسز اسلم کہ میں نے کبھی تکلّف نہیں کیا۔ وہ کسی نے کیا کہا ہے کہ ع اے ذوق تکلّف میں ہے تکلیف سراسر، کس شاعر نے کہا ہے یہ؟

زینت: ذوق نے!

لطیف: خوب! بھلا آپ کو کس طرح پتہ چلا؟

زینت: اسے ذوق جو کہا گیا ہے۔

لطیف: اوہ! اچھا! خیر تو میں نے سٹیشن پر جان بوجھ کر کھانا نہیں کھایا۔ سوچا کہ اسلم کے ہاں تو جا رہا ہوں۔

زینت: ہاں ہاں ضرور! (آواز دے کر) نبّو کھانا یہاں لگا دو۔

نبّو: (دوسرے کمرے سے) جی سرکار۔

لطیف: یہ اسلم کہاں ہیں؟

زینت: نہا رہے ہیں۔

لطیف: (آواز دیتے ہوئے) اماں اسلم نکل بھی چکو بھئی!

اسلم: (دوسرے کمرے سے) ابھی آیا، پانچ منٹ میں۔

(نبّو کھانا لگاتے ہے)

لطیف: (زور سے) تو ہم کھانا شروع کر دیں۔

اسلم: (دوسرے کمرے سے) ہاں شروع کر دو، میری راہ نہ دیکھو۔

لطیف: اُدھر تم ہاتھ مُنہ دھو رہے ہو۔ ادھر کہیں کھانے ہی سے ہاتھ نہ دھونے پڑ جائیں۔

اسلم: بس سمجھو آہی گیا۔ اے یہ لو۔۔۔۔۔ یہ آگیا۔

(اسلم آتا ہے)

اسلم: السلامُ علیکم! کہو کیسے راستہ بھول گئے؟

لطیف: تم سے ملے بہت دِن ہو گئے تھے۔۔۔ اور ہاں مسز اسلم ہمارا جی تو آج پراٹھوں کو چاہ رہا ہے۔ اللہ میاں نے پراٹھے بھی کیا نعمت بنائی ہے۔ اگر پراٹھے نہ ہوتے تو کس قدر بے لطفی رہتی۔

زینت: ابھی لیجئے۔ نبّو جاؤ- باورچی سے کہو کہ جلدی سے دھیمی آنچ پر پانچ چھ پراٹھے ڈال دے۔

لطیف: ہاں۔ کہو کہ ذرا جلدی تیار کر دے۔ یہی کوئی آٹھ دس پراٹھے۔

اسلم: لو یار یہ قورمہ نہایت تحفہ پکا ہوا ہے۔

لطیف: میرے دونوں ہاتھ رُکے ہوئے ہیں۔ تکلیف تو ہو گی ذرا میری پلیٹ میں ڈال دو۔

اسلم:　اور یہ کباب تو آپ نے چکھے ہی نہیں۔

لطیف:　بھئی تم دونوں بھی تو کچھ کھاؤ۔ ایمان سے تم تو صرف کھانے کا شگون ہی کرتے ہو۔

زینت:　مٹھاس تو چکھی ہی نہیں آپ نے۔

لطیف:　اررر! یہ پڈنگ وہاں کیا کر رہی ہے؟

زینت:　میں یہی سوچ رہی تھی کہ اس پڈنگ کا کیا بنے گا۔ چلو اچھا ہوا لطیف صاحب کے کام آ گئی۔

لطیف:　یہ میری خوش قسمتی ہے۔ مگر مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کہیں لطیف صاحب خود کام نہ آ جائیں۔

اسلیم:　دیکھو بھئی تم نے پھر تکلّف کیا۔

لطیف:　آں ہاں، آپ جانتے ہیں کہ تکلّف کے لیے تو میں بنا ہی نہیں۔ اچھا تو لائیے آپ کے لیے کھا لیتا ہوں ورنہ تو رتّی بھر گنجائش نہیں۔

اسلم:　بھلا تمہارے پیٹ میں اور گنجائش نہ ہو؟ تعجّب ہے۔ یہ بھی ایک ہی کہی۔ کالج کے زمانے میں تو بڑے خوش خوراک تھے ماشاء اللہ۔۔۔!

زینت: جی ہاں۔ میں نے بھی ان سے سنا ہے کہ کالج میں لڑکے آپ کو پیٹو نوجوان کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

لطیف: آہ! وہ بھی کیا دن تھے! مسز اسلم! آپ نے بھی کیا یاد دلایا۔ ذرا خیال کیجئے، مسز اسلم، ایک دفعہ میں ضد ہی ضد میں دو درجن انڈے اور ڈیڑھ درجن کیلے کھا گیا۔

زینت: الٰہی خیر! پھر کیا ہوا۔

لطیف: پھر کیا ہوا۔۔۔ ہونا کیا تھا۔۔۔۔ بس کھا گیا۔ اچھا بھئی بس! اب ہم سیر ہو گئے ہیں۔

زینت: بس

اسلم: بس!

نبّو: صاحب میں پلیٹیں اُٹھالوں؟

زینت: ہاں اٹھالو اور فوراً کافی لے آؤ۔

اسلم: سگریٹ پیجئے گا؟

لطیف: میں تو کھانے کے بعد حقّہ پینے کا عادی ہوں۔ جو لطف حقّے میں آتا ہے وہ سگریٹ میں کہاں؟

اسلم: بشرطیکہ تمبا کو اچھا بنا ہوا ہو۔

لطیف: ہاں چلم بھرنا بھی ایک زبردست آرٹ ہے۔ لیکن بھئی اسلم! اگر کسی کو نفاست سے حقّہ پیتے دیکھا تو وہ زندہ حسن کو، کچھ نہ پوچھو بس۔

اسلم: ہوں! کہاں ہیں وہ آج کل۔۔۔۔ نبّو حقّہ لا بے! جلدی کر۔

نبّو: لایا حضور۔

لطیف: سُنا تھا کہ دلّی میں ہیں۔

اسلم: میں نے زندہ حسن کے بارے میں کئی اور عجیب باتیں سنیں۔

لطیف: اچھا؟۔۔۔ ہم بھی سُنیں۔

(نبّو حقّی لاتا ہے)

اسلم: پچھلے سال مجھے کسی کام سے دلّی جانا پڑا۔ سوچا چلو لگے ہاتھ زندہ حسن سے بھی مل لوں۔ عرصہ ہو گیا تھا انہیں دیکھے۔ ایک دوست سے ان کا پتہ پوچھا، معلوم ہوا حضرت کہیں دور قبرستان کے پاس ایک ٹوٹے

پھوٹے مکان میں رہتے ہیں۔ خیر صاحب گرتا پڑتا وہاں پہنچا۔ عجب اُجاڑ سی جگہ میں ان کا مکان تھا، چاروں طرف اندھیرا گھپ۔ دروازے پر دستک دی۔۔۔ اندر سے آواز آئی۔۔۔۔ کون ہے ؟۔۔۔۔۔ میں نے کہا اسلم۔۔۔۔۔ اندر سے کوئی بولا ''اخاہ اسلم۔ سناؤ بھئی کب آئے ؟'' میں نے کہا۔ ''باہر تو آؤ'' کہنے لگے۔۔۔۔ ''ابھی آیا۔'' میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ دو چار منٹ ٹھہر کر پھر آواز دی۔۔۔۔۔ جواب ملا ''بھئی ابھی آیا کپڑے بدل رہا ہوں۔'' میں نے اور انتظار کیا سوچا شاید اندر خستہ حالت ہو گی اور بلاتے شرم آتی ہو گی۔ بیچارے خود باہر آرہے ہیں اسی طرح چند منٹ اور گزر گئے۔ میں نے پھر آواز دی۔ ''ارے میاں اب آ بھی چکو۔۔۔ گھنٹہ بھر سے باہر کھڑے ہیں''۔۔۔۔ آواز آئی ''بس ابھی آیا۔'' اتنے میں ایک سفید پوش بزرگ آ نکلے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ایک جنٹلمین قسم کا انسان کھڑا ہے تو پوچھنے لگے۔ میں نے بتایا۔۔۔۔۔ کہ زندہ حسن کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ وہ بولے کہ وہ تو یہ مکان ایک سال سے چھوڑ چکے ہیں۔ اب یہ مکان خالی پڑا ہے۔

لطیف: تو پھر اندر سے کون بول رہا تھا؟

اسلم:　　خدا جانے کون تھا؟

لطیف:　　اندر سے جو آواز آئی وہ کسی زندہ آدمی کی نہیں تھی؟

اسلم:　　آواز تو بالکل زندہ حسن کی تھی۔

(ننّو کافی لاتا ہے)

زینت:　　کافی پیجیے لطیف صاحب!

لطیف:　　جی ہاں! ایک پیالی بنا دیجیے۔۔۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ۔

اسلم:　　کیا سوچ رہے ہو؟

لطیف:　　یہی کہ اندر سے جو صاحب بول رہے تھے اگر وہ باہر آ جائے تو کیا ہوتا؟

زینت:　　جانے دیجیے اب اس قصّہ کو، یہ بتایئے کہ آپ چائے کتنے بجے پیتے ہیں؟

لطیف:　　جی آٹھ بجے (اسلم سے) بھئی اسلم۔ یہ تم نے زندہ حسن کا ذکر چھیڑ کر میری طبیعت پریشان کر دی۔

اسلم: لاحول ولا قوۃ! کیا معمولی سی بات تھی۔ اچھا اب جا کر سوؤ۔ شب بخیر (کچھ قدم جا کر پھر رُک جاتا ہے) اور ہاں تمہارا کمرہ دیکھ کر ایک بات یاد آ گئی۔

لطیف: بھئی اب کوئی ایسا ویسا قصّہ نہ چھیڑو۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔

اسلم: اس میں پریشانی کیا بات ہے، تم تو بڑے دلیر واقع ہوئے ہو۔

لطیف: دلیری سے اس کا کیا واسطہ۔ جانتے ہو میری طبیعت، کسی دوست کا ذکر سن کر رہا نہیں جاتا۔

اسلم: اور تم بھی میری طبیعت سے واقف ہو۔ اپنے دوستوں کے قصّے سنائے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جب ہم یہ مکان لینے لگ تو مالک نے ایک عجیب واقعہ سنایا مگر میں نے ہنس کر ٹال دیا اور کچھ پرواہ نہ کی۔

لطیف: کس بات کی؟

اسلم: کچھ نہیں! یونہی مکان والے صاحب نے صرف اتنا کہا تھا کہ ایک دفعہ اُن کے کسی عزیز کے کوئی دوست یہاں آ کر ٹھیرے، رات کو اچھے بھلے سوئے۔ اٹھے تو ان کی حالت بہت غیر تھی۔ عجیب بہکی بہکی باتیں

کرنے لگے۔ بس ایک لفظ تھا جس کا ورد وہ کر رہے تھے اور وہ تھا۔۔۔ ''سر کٹا''۔۔۔۔ کہتے تھے اس مکان میں کوئی سر کٹا رہتا ہے۔

لطیف: سر کٹا؟ کیا مطلب تھا ان کا؟

اسلم: یہی کہ انہیں ایک ایسا آدمی دکھائی دیا جس کا سر کٹا ہوا تھا۔ بالکل تن سے جدا۔

لطیف: مگر ایسا انسان زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟

اسلم: بھئی کون مسخرہ کہتا ہے کہ وہ زندہ تھا؟ رُوح تھی کوئی۔ خیر تو ان سر کٹے صاحب نے رات بھر انہیں خوب تنگ کیا۔ وہ دن اور آج کا دن وہ صاحب بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔

لطیف: سر کٹے صاحب؟

اسلم: جی نہیں وہ مکاندار کے عزیز دوست مگر مجھے یہاں کبھی کچھ نہیں دکھائی دیا۔ ہاں نوکر اکثر شکایت کرتے رہتے ہیں کہ اُنہیں سر کٹے صاحب ستاتے ہیں۔

لطیف: تو بھئی تم نے یہ مکان چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔

اسلم: کہہ جو رہا ہوں کہ ہمیں کبھی نہیں ستایا انہوں نے۔

لطیف: (ڈر کر ہنستے ہوئے) لیکن یہ تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ آئندہ بھی نہیں ستائیں گے۔

اسلم: مگر تم کیوں ڈرتے ہو؟ تمہارا تو یہ ایک گھر سا ہے۔ اچھا بھئی شب بخیر۔ بشرطِ زندگی صبح ملیں گے۔

لطیف: (کمزور آواز میں) بشرطِ زندگی۔۔۔۔ ایں؟۔۔۔۔۔ اچھا شب بخیر۔

(لطیف جاتا ہے)

اسلم: (نبّو سے) اگر ذرا سی چوک ہوئی تو بنا بنایا کام بگڑ جائیگا۔

نبّو: حضور بے فکر رہیں۔

اسلم: اچھا جاؤ۔۔۔۔ لیکن اپنا کام ذرا ٹھہر کر شروع کرنا۔

نبّو: اور جو وہ سو گئے تو؟

اسلم: تم بے فکر ہو۔ جو قصّے لطیف صاحب نے آج سنے ہیں وہ اُن کو رات بھر جگانے کے لیے کافی ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا سین

مہمانوں والا کمرہ، کمرے میں اندھیرا ہے، تھوڑے سی روشنی بھی ہے۔ لطیف بستر پر کروٹیں بدل رہا ہے، ایک دو مرتبہ کوئی سُر گنگناتا ہے۔ پھر چپ ہو جاتا ہے۔

(باہر سے بلّی کی میاؤں سنائی دیتی ہے)

لطیف: (چونک کر)۔۔۔۔ ہیں یہ کون؟۔۔۔ اوہ بلّی؟۔۔۔۔ واہ۔۔۔ میاؤں (نقل اتارتا ہے)

لطیف: یہ بلّی کہاں سے بول رہی ہے؟

(اس مرتبہ میاؤں نہایت خوفناک آواز سے کی جاتی ہے)

لطیف: کون ہے؟

نبّو: کی بدلی ہوئی آواز (باہر سے) کون ہے؟

لطیف: تم کون ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟

نبّو: بول تو رہے ہیں۔۔۔ سُن لو۔۔۔۔ میاؤں۔۔۔۔ (چیخ کر) میاؤں۔

لطیف: خدا کے لیے آخر تم ہو کون؟

نبّو: (قہقہہ لگا کر ڈراؤنے انداز میں) میں کون ہوں؟ پہچانا نہیں۔ (قہقہہ)

لطیف: (ڈرتے ہوئے) صاحب میں آپ کو نہیں جانتا۔ دل لگی چھوڑیئے بتایئے آپ کون ہیں؟

نبّو: اس کمرے کا مالک۔

لطیف: اس کمرے کا مالک؟ اچھا کیا چاہتے ہیں۔

نبّو: ہاہاہا! ہم کیا چاہتے ہیں؟ تو گویا ہم بتا ہی دیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ بتا دیں؟

لطیف: (ڈرتے ڈرتے) آپ۔۔۔۔ آپ جو کچھ بھی ہیں۔ تشریف لے جایئے مجھے سونے دیجیے۔

نبّو: تم سونا چاہتے ہو؟ ہم سلا دیتے ہیں۔ بالکل سلا سکتے ہیں۔

لطیف: (ڈر کر) نہیں نہیں، مجھے معاف فرمایئے۔ میں خود سو جاؤں گا۔

نبّو: تم خود نہیں سو سکتے جب تک ہمارا حکم نہ ہو۔

لطیف: (ذرا ہمّت کرتے ہوئے) آپ۔ آپ حکم دینے والے ہوتے کون ہیں؟

نبّو: تمہاری زبان چلتی ہے۔ ہم اس کا بھی انتظام کئے دیتے ہیں۔

لطیف: (ڈر کر) نہیں نہیں، میں اب کچھ نہیں بولوں گا۔ آپ مہربانی کر کے تشریف لے جائیں۔

نبّو: ہم رات کو سویا نہیں کرتے۔

لطیف: تو قبلہ میں تو رات کو اکثر سویا کرتا ہوں۔

نبّو: نہیں تمہیں آج ہمارے ساتھ جاگنا پڑے گا۔

لطیف: کوئی زبردستی ہے؟ آپ شوق سے ساری رات جاگیں۔۔۔۔ بھلا میں رات کو جاگ کر کیا کروں گا؟

نبّو: ابھی ابھی چند اور سر کٹے حضرات آنے والے ہیں۔ ہم سب مل کر کچھ پئیں گے۔ ساتھ ساتھ بِرج ہو گا۔

لطیف: آخر میرا قصور؟

نبّو: یہی کہ تم نے ہمارے کمرے پر قبضہ کر رکھا ہے، ہم تمہاری روح قبض کریں گے۔

لطیف: (ڈر کر) نہیں نہیں قبلہ! میں کوئی اپنی خوشی سے تھوڑا ہی یہاں ٹھیرا ہوں۔ زبردستی ٹھیرایا گیا ہوں۔ آپ فرمائیں تو صبح ہوتے ہی فوراً کہیں چلا جاؤں۔

نبّو: اچھا! ہم انتہائی رحم دلی سے کام لیتے ہوئے تمہیں رات بھر کی مہلت دیتے ہیں۔ کل صبح آٹھ بجے کے بعد تم اگر اس مکان کے کسی حصّے میں بھی دکھائی دیے تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔

لطیف: میں خدا کو حاضر ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ۔

نبّو: تم وکیل معلوم ہوتے ہو کیوں؟

لطیف: جی ہاں! بھلا آپ کو کیسے پتہ چلا؟

نبّو: ہمیں سب چیزوں کے متعلق سب کچھ پتہ ہے۔

لطیف: جی تو میں قسم کھاتا ہوں کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے کوچ کر جاؤں گا۔

نبّو: نہیں گئے تو پھر دوسرے جہان کو کوچ کرنا پڑے گا۔

لطیف: آپ بے فکر رہئے، صبح آٹھ بج کر پانچ منٹ کے بعد اس گھر میں ٹھیرنے والے پر تین حرف۔

نبّو: تم شکر کرو کہ تم سے پہلے اس کمرے میں ٹھیرنے والے کی مرمت ہم کر چکے ہیں ورنہ تمہاری گوشمالی ضرور کی جاتی۔ اچھا تم جاتے ہیں۔

لطیف: شکریہ! میں حضور کا یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ اچھا خدا حافظ!

نبّو: بھولنا نہیں ورنہ، پھر حافظ خدا تمہارا۔۔۔

(نبّو قہقہہ لگاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

دوسرے روز وہی پہلے سین والا کمرہ، میز پر چاء رکھی ہے، نبّو چینی کے برتن اور چمچے میز پر رکھ رہا ہے۔ کلاک آٹھ بجاتا ہے، اسلم اور زینت داخل ہوتے ہیں۔

نبّو: سلام حضور! چاء لگ گئی ہے۔

زینت: سلام، جاؤ لطیف صاحب کو بلا لاؤ۔

نبّو: بہت اچھا حضور۔

(جاتا ہے)

ایک وقفہ

اسلم اور زینت دونوں کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ ہے۔

(لطیف داخل ہوتا ہے)

لطیف: (بڑی گرم جوشی سے) آداب عرض آداب عرض!

زینت: آداب عرض! سُنایئے رات تو آرام سے سوئے؟

لطیف: آرام؟ کچھ نہ پوچھئے۔ سوتے ہی ایسا بے ہوش ہوا کہ صبح ہی پتہ چلا۔

اسلم: ہیں؟ تو گویا آرام سے سوتے رہے رات بھر؟ میرا مطلب ہے تمہاری آنکھیں تو ایسی لال لال سی ہو رہی ہیں جیسے رات بھر جاگے ہو۔

لطیف: اجی آنکھوں کا کیا ہے؟ آنکھوں سے کچھ اندازہ نہ لگائیے۔ یہ سُرخی نہیں، خمار ہے، بلکہ سچ پوچھو تو بھوک کا خمار۔

اسلم: لیکن چہرے سے تو کچھ اور ہی آثار نظر آرہے ہیں۔

لطیف: صاحب عرض تو کر دیا کہ بھوک کا خمار ہے اور کچھ نہیں۔ اچھا ایک پیالی چاء تو عنایت کیجئے۔

اسلم: یہ لیجئے! میں تو ڈرتا رہا کہ کہیں وہ سر کٹا تمہیں تنگ نہ کر رہا ہوں۔

لطیف: اجی کیسے سر کٹے؟ وہاں تو کوئی سر والا تک نہیں آیا۔ ذرا دودھ اور ڈالیے۔ بس شکریہ۔

زینت: یہ لیجئے انڈے اور ٹوسٹ۔

لطیف: کچھ دلیا ہو گا۔

زینت: وہ بھی آرہا ہے۔

لطیف: میں صبح کے وقت سیب کا مربّہ اور پندرہ بادام چکھا کرتا ہوں۔ تلے ہوئے بادام کی اور بالائی تو ناشتے کے ساتھ ہی آتی ہی ہو گی، رہ گئی نمکین چیزیں سو یہی ایک پراٹھے، ایک آدھا کباب۔ دو چار مچھلی کے قتلے اور آملیٹ وغیرہ کی قسم کی چیزیں کافی ہوں گی۔ آپ لوگ صبح صبح شہد نہیں کھاتے کیا؟

زینت: جی نہیں۔

لطیف: افوہ آپ شہد سچ مچ نہیں کھاتے کیا؟ صحت کے لیے نہایت مفید چیز ہے۔ حد کرتے ہو بھئی۔

اسلم: اب کھایا کریں گے۔

لطیف: مجھے ایک ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ اگر میں نے ہر روز دوپہر کو بھُنا ہوا مرغ نہ کھایا تو۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔۔

اسلم: تو کیا ہو جائے گا۔

لطیف: ایک لمبی سی بیماری کا نام کیا تھا کہ وہ ہو جائے گی۔ مجھے اپنی صحت کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اس لئے تکلّف کو ایک طرف رکھ کر بندہ صاف صاف

کہتا ہے کہ دوپہر کے کھانے کے ساتھ کم از کم ایک بھُنا ہوا مرغ ضرور ہونا چاہئے۔

اسلم: ہاں ہاں ضرور۔

(لطیف بدستور کھا رہا تھا)

لطیف: سہ پہر کی چائے کے متعلق کسی ڈاکٹر نے مجھے کوئی تاکید نہیں کی البتہ ایک حکیم نے کہا تھا کہ تقویتِ قلب کے لیے انڈوں کا حلوہ اور اونٹتے ہوئے دودھ کا ایک گلاس سہ پہر کی چائے کے ساتھ ضرور ہونا چاہیے اور بعد میں فوراً ہی نمکین پستے، کچھ اخروٹ کا ذائقہ بدلنے کے لیے چکھ لیے جائیں۔

اسلم: خوب!

زینت: خوب!

لطیف: رات کے کھانے پر میں یہی سوچتا رہا کہ یہ تمہارا بالکل معمولی کھانے پکاتا ہے۔ معاف کیجئے۔ میں تکلّف کے متعلّق پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ کہ یہ خاکسار کی عادت نہیں۔ جب تک رات کے کھانے پر کوئی نرالی چیز یعنی عجیب و غریب چیز۔۔۔۔ نہ چُنی جائے تب تک نہ تو

دن بھر کی تھکاوٹ دُور ہوتی ہے اور نہ رات کو نیند ہی آتی ہے۔ شاید اسی لیے تم دونوں کی صحت اب ایسی نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔

اسلم: نرالی چیزوں سے تمہارا مطلب؟

لطیف: وہ چیزیں۔۔۔۔۔ بہتیری ہو سکتی ہیں۔ مثلاً گوشت کا حلوہ، امر دوں کا شوربہ، گوشت اور سنگتروں کا سالن۔۔۔۔!

زینت؛ اسلم: گوشت اور سنگتروں کا سالن؟

لطیف: جی ہاں اور مرغ کا حریرہ، بالائی کے کباب وغیرہ وغیرہ، نبّو شاید اُنہیں تیار کرنا نہ جانتا ہو لیکن مجھے ایسی بے شمار ترکیبیں یاد ہیں۔

(کھانا ختم کر دیتا ہے)

زینت و اسلم: بس؟

لطیف: جی ہاں بس! اب میں ذرا ہاتھ دھو لوں۔

(لطیف باہر جاتا ہے)

زینت: (آہستہ سے) یہ سُن لیا تو نے، توبہ ہے الٰہی! کون سے گناہوں کی سزا ملنے والی ہے؟

اسلم: اور بھیجو نبّو کو بھُوت بنا کر، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔

زینت: واہ جیسے آپ تو اس سازش میں شریک تھے ہی نہیں۔ کیسے معصوم بنتے ہیں؟ (سہم کر) توبہ توبہ ۔۔۔۔ سنگتروں کا سالن، مالٹوں کا حلوہ، اناروں کے کباب ۔۔۔۔۔!

اسلم: آخر اب کیا کیا جائے؟

زینت: مجھے کیا معلوم؟ میں تو جاتی ہوں اپنی امّی کے ہاں۔

اسلم: اور میں بھی چلتا ہوں کسی دوست کے پاس۔

(لطیف تولیے سے ہاتھ پونچھتا ہوا واپس آتا ہے)

لطیف: بھئی یہ کیا کُسر پھُسر ہو رہی ہے۔ ہم بھی تو سُنیں۔ غالباً تم لوگ میرے آرام کا فکر کر رہے ہو۔ یہی ہے نا! اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ میرا کمرہ۔ آہ ۔۔۔۔ ایسے آرام دہ کمرے میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ اب رہ گیا میرے کھانے کا انتظام ۔۔۔۔۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کے بیش قیمت ارشادات کے مطابق جو پرہیزی غذا میں نے بتائی ہے۔ اِس کا انتظام نبّو کر سکتا ہے۔

اسلم: نبّو جس طرح لطیف صاحب کہیں اسی طرح کیا کرو۔

زینت: (مری ہوئی آواز میں) بس اسی طرح کیا کرو۔

لطیف: شکریہ! سُن رہے ہو نبّو۔

نبّو: جی ہاں سُن رہا ہوں۔

(آدھ منٹ کا وقفہ، جس میں اسلم بے چینی ظاہر کر رہا ہے)

اسلم: اچھا بھئی لطیف اب مجھے اجازت دو ایک نہایت ضروری کام ہے کسی دوست سے ملنا ہے۔

زینت: اور مجھے بھی ایک سہیلی کے ہاں جانا ہے۔ بہت ہی ضروری کام ہے۔ ان کے کام سے بھی زیادہ ضروری۔

لطیف: اچھا!۔۔ لیکن دوپہر کو ذرا جلدی تشریف لے آیئے، مجھے ساڑھے دس بجے ہی سے بڑی شدّت کی بھوک لگ جاتی ہے۔ اور آج تو ناشتا بھی کچھ ہلکا پھلکا سا رہا۔

(زینت اور اسلم جاتے ہیں)

نبّو: تو صاحب! میں بھی ذرا باہر جا رہا ہوں۔۔۔ وہ میرے چچا۔۔۔

لطیف: چچاوچاکچھ نہیں تم ہمارے پاس بیٹھو۔

نبّو: بہت اچھا حضور۔

(لطیف نبّو کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتا ہے)

لطیف: ایک عجیب تماشا ہوا رات کو، کوئی مسخرا ہمیں ڈرانے کی کوشش کرتا رہا۔

نبّو: اور آپ ڈر گئے کیا؟

لطیف: نہیں تو ہم کیوں ڈرتے؟ لیکن بڑی دیر کوشش کرتا رہا۔

نبّو: حضور کو ڈرانے کی کوشش؟ اجی یونہی کوئی بھوت یا چڑیل ہو گی۔ ورنہ کسی کی کیا مجال جو اس کوٹھی میں رات کو پھٹک بھی جائے۔

لطیف۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ کوئی بھوت ہی ہو۔ لیکن وہ اصلی بھوت تو تھا نہیں۔ انسان نما بھوت تھا۔

نبّو: (سہم کر) بھوت نما بھوت تھا۔۔۔ ایں۔۔۔۔۔ بھوت نما انسان تھا؟ کیا فرما رہے ہیں۔۔۔ تو گویا آپ کو پتہ چل گیا۔۔۔، یعنی میرا۔ مطلب ہے کہ۔۔۔۔

لطیف:　ہاں ہاں! ہم تمہارا مطلب خوب سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ یہ کہ وہ شخص یہاں پہنچا کیسے؟

نبّو:　(گڑ گڑا کر) صاحب میں بالکل بے قصور ہوں۔ یعنی میں۔۔ یعنی مجھے بالکل پتہ نہیں۔ میں تو رات کو کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

لطیف:　نبّو! ہم نے سنا ہے کہ تم اچھے خاصے مسخرے ہو۔۔۔!

نبّو:　(چونک کر) مسخرہ ہوں۔۔۔ نہیں تو۔

لطیف:　اور شاید تم تھیٹر میں پارٹ بھی کرتے رہے ہو۔ بس ایک بات ہمیں اور بتادو کہ وہ شخص یہاں آ کیسے گیا؟

نبّو:　لیکن میں تو۔۔۔

لطیف　:ہاں ہاں تم تو رات بھر باہر رہے ہو۔ لیکن سوچنے میں کیا ہرج ہے؟

(آدھ منٹ کا وقفہ)

لطیف:　بتاؤ بتاؤ۔۔۔ کوشش کرو۔۔۔ ہاں تو شاباش۔۔۔!

نبّو:　میرا خیال ہے کہ وہ شخص رات کو ایک بجے بڑے پھاٹک سے گزرا ہو گا۔ پھر اس نے باغ میں کھڑے ہو کر سوچا ہو گا کہ دیوار پھاند کر

کوٹھی کے اس طرف آئے یا اُس اونچے سے آم کے درخت پر چڑھ کر دوسری طرف مرغیوں کے ڈربے پر کود جائے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا ہوگا کہ دیوار پھاندنا بہتر ہے کیونکہ ڈربے پر کودنے سے مرغیاں جاگ اٹھیں گی اور شور مچا دیں گی۔ بس تو جناب وہ پھر چپکے چپکے برآمدے تک پہنچا ہوگا۔

لطیف: ہاں ہاں! پھر۔۔۔؟

نبّو: تو پھر جب وہ برآمدے میں پہنچا ہوگا تب اسے کتّے کی فکر پڑی ہوگی۔ لیکن کتّا وہاں نہیں تھا۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ کتّا وہاں نہیں ہوگا، پھر وہ دبے پاؤں دروازے تک پہنچا ہوگا۔۔۔۔ اب وہاں پہنچ کر جو میں دیکھتا ہوں تو دروازہ بند (ہڑبڑا کر) صاحب میں نہیں۔۔۔۔ لیکن جب اُس نے دیکھا ہوگا تو دروازہ بند ہوگا۔ یہ میرا خیال ہی خیال ہے

لطیف: ہمارا بھی یہی خیال ہے۔۔۔۔۔ اچھا تو پھر کیا ہوا ہوگا؟

نبّو: جی تو پھر اس نے اندر جھانک کر دیکھا ہوگا کہ آپ سونے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی ہوگی لیکن دروازہ تو آپ بند کر چکے تھے۔ لیکن مجھے فوراً یاد آیا کہ دوسرے

دروازے سے بھی۔۔۔۔۔اف کیاواہی تباہی بک رہاہوں۔جناب!یہ میں اس شخص کی باتیں بتارہاہوں۔شاید اس نے اسی طرح کیاہو گا۔ میں تو ساری رات باہر رہا ہوں۔ اور یہ صرف میرا خیال یہی خیال ہے۔

لطیف: ہمارا بھی یہی خیال ہے۔تم بتاتے جاؤ۔

نبّو: تو پھر وہ چپکے سے دوسرے دروازے تک پہنچا ہو گا۔ اُسے وہاں بڑی خوشی ہوئی ہو گی۔ کیونکر دروازہ کھلا تھا۔یعنی کھلا ہو گا۔ اس کے بعد مجھے یعنی کہ اُسے۔۔۔یعنی کہ وہ۔۔۔۔۔!

لطیف: یعنی کہ اس نے یعنی کہ تم نے یعنی کہ وہ بولا ہو گا، میں بھُوت ہوں۔ پھر اس نے کہاہو گا کہ کمرہ چھوڑ دو، پھر یعنی کہ وہ یعنی کہ تم۔۔۔۔۔۔ یعنی کہ دونوں۔

یعنی: آپ سمجھتے ہیں(گھگھیا کر)میرا تو صرف خیال ہی خیال ہے۔

لطیف: ہمارا بھی یہی خیال ہے۔

(پردہ گرتا ہے)

زیادتی

نہ جانے کیا بات تھی۔ امتحان دینے کو بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ امتحان کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا۔ اس سے پہلے کتنی مرتبہ امتحان دئے تھے۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ گھر میں شور تھا نہ غل، مکمل خاموشی۔ ماحول امتحان دینے کی لیے بہترین تھا۔ وقت پر سب کچھ مل جاتا۔ جی چاہے ساری ساری رات پڑھتے رہو۔ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں کہ کیوں پڑھ رہے ہو؟ کیا پڑھ رہے ہو؟ امتحان کی وجہ سے کوئی ملنے بھی نہ آتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود بے حد اداس تھا اور آج سے کئی سال پہلے کا ایک امتحان رہ رہ کر یاد آرہا تھا جس میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ایسا عجیب و غریب امتحان میں نے کبھی نہ دیا تھا۔ میرے خیال میں آخری مہینے میں مَیں نے ایک حرف نہیں پڑھا۔ پرچے بھی کیسے اُلٹے سیدھے کئے، سوالوں کے جواب ایسے دئے جن کا نہ سر تھا نہ پیر۔ بیٹھا ہوں امتحان کے کمرے میں اور سوچ رہا ہوں رضیہ کے متعلق۔ پتہ نہیں کہ کس مضمون کا پرچہ سامنے رکھا ہے۔ کیا سوال پوچھے گئے ہیں۔ اور میں کیا لکھ رہا ہوں۔ اور جب نتیجہ نکلا تو میں پاس ہو گیا۔

کس قدر تعجب ہوا تھا اور ساتھ ہی کتنی خوشی ہوئی تھی۔ یکے بعد دیگرے رضیہ کے کئی تار آئے۔ جج صاحب اور بیگم نے بھی مبارکباد کے تار بھیجے۔ گھر سے بھی شاباش ملی۔ اور میں جو امتحان میں فیل ہو جاتا تو ساری شیخی دھری رہ جاتی۔ رضیہ کو کوئی نہ پوچھتا سب کے سب میرے پیچھے پڑ جاتے کہ نالائق ہے۔ پڑھتا نہیں تھا۔ سینما دیکھتا رہتا تھا۔ سارا دن کھیلتا رہتا تھا اور رضیہ نے جو جو شرارتیں کیں وہ اس وقت کتنی بُری معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن انہیں دل میں دہرانے سے کیا لطف محسوس ہوتا۔ اب وہی میں تھا وہی زندگی تھی اور وہی امتحان۔ اب تنہائی بھی تھی۔ نہ کوئی ستاتا تھا نہ چھیڑتا تھا۔ زندگی کس قدر بے رنگ و بو معلوم ہو رہی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اتوار تھا۔ جب میں نے ہوسٹل چھوڑا اور جج صاحب نے مجھے اپنی کوٹھی کا سب سے الگ تھلگ کمرہ اس لیے دیا کہ میں اچھی طرح پڑھ سکوں۔ امتحان میں صرف ایک مہینہ باقی تھا۔ گھر سے ہر دوسرے تیسرے روز خط آتا کہ شاباش گھبرانا مت، مزے مزے سے امتحان دو۔ پھر کشمیر کی سیر کرنا۔۔۔ یہ اور وہ طرح طرح کے لالچ دئے جاتے تھے۔

میں نے کتابیں ترتیب سے رکھیں اور سوچا کہ فقط آج کا دن اور ضائع کر لیں۔ تھوڑی سی کرکٹ کھیلیں۔ تھوڑا سا تیر لیتے ہیں اور ایک پکچر دیکھ لیں گے۔ بس! کل سے پڑھائی شروع کر دی جائے گی۔

تیرنے کے بعد ایک دوست نے مدعو کر لیا۔ اور پکچر نہ دیکھ سکا۔ چنانچہ اگلا روز اسی رسّہ کشی میں گزر گیا کہ دیکھ لوں یا رہنے دوں، پھر سوچا خوا مخواہ ایک بوجھ سا رہ جائے گا طبیعت پر چلو دیکھ لیتے ہیں۔ میں چپکے سے باہر نکلا اور رضیہ نے پکڑ لیا۔ بولی میں ابھی سب سے کہتی ہوں کہ آپ سیکنڈ شو دیکھنے جا رہے ہیں۔ بڑی منتّیں کیں، بولی اچھا ہمیں ساتھ لے چلیئے۔ میں بڑا اسٹپٹایا۔۔ ”اچھا اجازت لے آؤ جا کر۔“

”آپ خود اجازت لے آیئے، ابّا لائبریری میں ہیں۔“ وہ بولی اور خوب بحث ہوئی۔ جج صاحب مجھے تو اجازت دے دیتے لیکن رضیہ ابھی پہلا شو دیکھ کر آئی تھی بحث کا نتیجہ نکلا کہ نہ رضیہ گئی اور نہ میں۔ مجھے چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس آنا پڑا۔

اگلے روز علی الصبح کوئی گروپ فوٹو تھا۔ وہاں سے جب لوٹا تو دیکھتا ہوں کہ میرے کمرے میں ایک مضبوط تالا لگا ہوا ہے۔ اور چابی ندارد۔ چابی کی ڈھنڈیا پڑی۔ سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ دوپہر تک میں برآمدے میں چہل قدمی کرتا رہا اور

رضیہ اپنے کمرے سے جھانکتی رہی۔ آخر جھنجھلا کر ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ وہاں شام تک پڑھتا رہا۔ جب واپس آیا تو تالا غائب تھا۔ کمرہ کھولا۔ اندر سے کئی کتّے چھلانگیں مارتے ہوئے میرے اوپر سے گزر گے اور میں ڈر گیا۔ یہ ضرور رضیہ کی کارستانی تھی۔

صبح صبح کتاب لے کر بیٹھا ہی تھا کہ ساتھ کے کمرے میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ کرسیاں گھسیٹی گئیں۔ میزیں اُلٹ دی گئیں۔ گلدان نیچے پھینک دیے گئے۔ اور رضیہ چھلاوے کی طرح میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ ہاتھ میں اخبار تھا۔ چہرہ صبح کے تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح شگفتہ اور حسین تھا۔ آنکھوں میں شرارت تھی۔

"یہ تازہ خبر سنی آپ نے، بڑی مفید اور ضروری خبریں ہیں۔" وہ بولی۔

"جی نہیں اوّل تو مجھے خبروں سے ایسی دلچسپی نہیں۔ اور دوسرے یہ دوپہر کو ریڈیو پر سُن لوں گا۔"

"خیر! اگر آپ اخبار پڑھنا نہیں چاہتے تو نہ پڑھئے۔ میں آپ کو پڑھ جر سناتی ہوں۔ پہلے خبر یہ ہے۔۔۔۔"

نئی دہلی۔۔۔۔ آج ریلوے کے بڑے بڑے افسروں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں یہ طے ہوا کہ چونکہ ریل کے آخری ڈبّے میں جھٹکے بہت لگتے ہیں اس لیے آئندہ ریل میں آخری ڈبّہ نہ لگایا جائے۔۔۔۔ یہ دیکھا آپ نے کیسی کار آمد خبر ہے، اب ریل میں آخری ڈبّہ نہیں ہوا کرے گا۔"

"بھئی رضیہ۔۔۔۔۔!"

"اچھا اور دوسری خبر یہ ہے کہ کولمبو میں ابوالہول صاحب نے تقریر فرماتے ہوئے فرمایا کہ ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ اپنے وطن سے پیار کرے، اپنے وطن سے پیار کرے، خواہ وہ وہاں پیدا ہوا یا نہ پیدا ہوا ہو۔"

"لیکن میرا امتحان ہے۔۔۔!"

"مجھے معلوم ہے اور تیسری خبر یہ ہے۔ خبر کیا ہے اشتہار ہے، ایک صاحب کی گائے کھوئی گئی ہے۔ انہوں نے گائے کا حلیہ لکھا ہے اور یہ لکھا ہے کہ جو صاحب اس گائے کا اتا پتہ بتائیں گے، انہیں ایک عدد بچھڑا انعام میں دیا جائے گا۔ گائے اگر خود یہ اشتہار پڑھے یا کہیں سے سُن پائے تو بے شک واپس چلی آئے۔ ہم اسی کچھ نہیں کہیں گے اور بچھڑا بے حد اداس ہے اس نے چار روز سے کھانا کھایا ہے نہ چائے پی ہے۔"

”رضیہ۔۔۔۔“

”چوتھی خبر یہ ہے۔۔۔۔۔۔ پشاور۔ کل یہاں ایک عجیب حادثہ ہوا جس سے سارے شہر میں سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ پبلک بے چین ہے اور پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ آج صبح ایک بزرگ نے جن کی داڑھی بہت لمبی تھی، سائیکل چلاتے ہوئے ایک بڑھیا کے ٹکّر مار دی۔ بڑھیا بہت ناراض ہوئی اور ڈانٹنے لگی کہ شرم تو نہیں آئی ہو گی۔ اتنی لمبی داڑھی لئے پھرتے ہو اور سائیکل بھی چلائی نہیں آتی۔ ٹکریں مارتے پھرتے ہو۔ بزرگ نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔ مائی! یہ داڑھی ہے بریکیں تھوڑا ہی ہیں۔“

میں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور جب رضیہ چلی گئی تو غور سے انگریزی کا ایک مضمون پڑھنے لگا جس میں لکھا تھا کہ حسین لڑکیاں ہمیشہ مہربان اور ہمدرد ہوتی ہیں۔ کسی نالائق نے لکھا ہے یہ؟ میں نے کتاب بند کر دی اور دیر تک بے وقوفوں کہ طرح بیٹھا رہا۔

رات کا وقت تھا اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ برآمدے میں جا بیٹھوں، بڑا لطف رہے گا لیکن پھر امتحان کا ڈر اور ساتھ ہی یہ خیال بھی کہ اس وقت جتنا پڑھ سکتے ہو پڑھ لو۔ اس وقت رضیہ کے آنے کا کوئی خطرہ نہیں

ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ کھٹ سے دروازہ کھلا اور رضیہ داخل ہوئی، ہاتھ میں کتابیں لئے اور پانی میں شرابور۔

”آپ پڑھتے رہئے۔ میں آپ کا وقت ہرگز ضائع نہیں کروں گی۔ میں تو بس ایسے ہی چلی آئی۔ چھٹیوں کا کام کرنا ہے وہاں بچّے شور مچا رہے ہیں۔“

میں خاموش رہا۔

”آپ نے مالی کو کب دیکھا تھا؟“

”شام کو!“ میں بدستور کتاب پڑھتا رہا۔

”اب کیا حال ہے بے چارے کا، کونین سے بخار اترا کیا؟“

”ہاں بخار ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن کمر کا درد بدستور ہے۔“

”تو پھر کونین ہی جاری رکھئے۔ کل پرسوں تک کمر بھی ٹوٹ جائے گی۔“

کچھ دیر کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔

”آپ ذرا میرا امتحان تو لے کر دیکھئے۔ یہ رہی سائنس کی کتاب اسے میں نے ابھی ابھی ختم کیا ہے۔ آپ اس میں سے کوئی سوال پوچھئے۔“

میں نے کتاب لے لی اور ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔۔۔”بتاؤ آکسیجن اور ہائیڈروجن میں کیا کیا فرق ہیں؟“

”آج کل تو کوئی فرق نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”سنا ہے آج سے چند سال پہلے بڑے اختلافات تھے اور آپس میں دنگا فساد رہتا تھا۔ لیکن اب صلح ہو گئی ہے اور اب کوئی اختلاف نہیں رہا۔“

”تمہیں سائنس کون پڑھاتا ہے؟“

”استانی صاحبہ!“

”استانی صاحبہ کون ہیں؟“

”ایک عورت۔“

”عورت تو ہیں۔ لیکن کیا یہی پڑھاتی ہیں وہ؟“

”جی نہیں، پڑھاتی تو وہ بہت کچھ ہیں۔ لیکن ہم دونوں کے خیالات مختلف ہیں۔“

”تم سکول کا کام کہاں کیا کرتی ہو؟“

”حسینہ کے ساتھ۔“

”اور حسینہ کہاں پڑھتی ہے؟“

”میرے ساتھ۔“

”یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ تم دونوں کہاں پڑھتی ہو؟“

”ہم دونوں اکٹھے پڑھتے ہیں۔“

”اچھا! مجھے اب پڑھنے دو۔“ میں نے لیمپ اپنی طرف سرکالیا۔

”اس لیمپ کو ذرا اس طرف کر دیجئے۔ ہماری آنکھوں پر روشنی پڑتی ہے۔“

”بھئی! اب چپ بھی رہو۔ لیمپ یہیں رہے گا۔“ میں نے منّت سے کہا۔

اس نے فوراً کمرے کے سارے قمقمے روشن کر دیے اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

”رضیہ روشنی کم کر دو، آنکھیں چندھیاتی ہیں۔“

"آپ دیوار کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ جایئے روشنی کم ہو جائے گی۔"

"اچھا! ذرا وہ سگریٹ کا ڈبّہ تو اٹھا دو۔"

"آپ فرض کر لیجئے کہ سگرٹ پی چکے ہیں۔"

"اچھا ذرا باہر جا کر دیکھو تو سہی کہ بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔"

"ابھی ہو رہی ہے۔"

"باہر جا کر دیکھو" میں نے ذرا رعب سے کہا۔

"ابھی ابھی ایک بلّی باہر سے آئی ہے اور بیچاری بھیگی ہوئی ہے۔ آپ ہمیں ناحق ڈسٹرب کرتے ہیں، ہمیں پڑھنے دیں۔"

اور میں نے دل میں قسم کھا لی کہ کل جج صاحب سے اجازت لے کر ہوسٹل واپس چلا جاؤں گا۔

اگلے روز میں سیدھا بیگم صاحبہ کے پاس پہنچا، وہ کچھ لکھ رہی تھیں۔ رضیہ پاس بیٹھی پھولوں کو گلدان میں سجا رہی تھی۔

میں نے بیگم صاحبہ کو مؤدبانہ سلام کیا۔ وہ بولیں ”جیتے رہو۔“

”بات یہ کہ یہاں اچھی طرح پڑھا نہیں جاتا اور امتحان نزدیک آ گیا ہے۔ گنے گنائے دن رہ گئے ہیں۔“

”خوب تو گویا مکمل تیاری ہو گئی ہے۔“ وہ بدستور مصروف تھیں۔

”جی نہیں! ایک لفظ نہیں پڑھا۔ کمرے میں وہ دھما چوکڑی مچتی ہے کہ الاماں۔ بھلا شوروغُل میں کوئی پڑھ سکتا ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ انہوں نے لکھتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ سُنتی تو ہیں نہیں۔ میں اجازت لینے آیا ہوں۔ میں واپس ہوسٹل جانا چاہتا ہوں۔“

”ہوٹل۔۔۔!“ انہوں نے پوچھا۔

”جی نہیں اقامت خانے میں۔۔۔۔۔“

رضیہ بولی۔ ”امّی یہ اجازت مانگ رہے ہیں۔ بھلا آپ انہیں پاگل خانہ جانے کی اجازت دے دیں گی کیا؟ یہ وہاں جانا چاہتے ہیں۔“

"پاگل خانہ !غضب خدا کا۔" بیگم کے ہاتھ سے قلم گر پڑا۔ "یہ کیا نئے نئے شوق اُٹھتے ہیں تم لڑکوں کے دل میں، توبہ توبہ یہ پاگل خانہ جانا چاہتا ہے لڑکا؟"

"اجی وہاں نہیں، دراصل میں جانا ضرور چاہتا ہوں۔ لیکن۔۔۔۔۔!"

"لیکن ویکن کچھ نہی، لڑکے عقل کا ناخن لے۔ اگر تیری امّی کو معلوم ہو گیا تو وہ کیا کہیں گی، مجھے تو اب تک یقین نہیں آتا۔۔۔۔ کیا سچ مچ۔۔۔۔۔؟"

"آپ سُنتی تو ہیں ہی نہیں، میں نے عرض کیا تھا کہ۔۔۔۔!"

"خاک عرض کیا تھا۔ ڈھول عرض کیا تھا۔ ہرگز نہیں میں ایک لفظ نہ سُنوں گی۔ تعجب ہے کہ تم سا عقلمند لڑکا ایسی باتیں کرنے لگے۔"

اور باہر سے ہارن کی آواز آئی۔ جج صاحب آرہے تھے۔ میں بھاگا۔ اپنے کمرے کی طرف۔ اگر انہوں نے یہ قصّہ سن لیا تو ایک نئ مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔

شام کو رضیہ صاحبہ تشریف لائیں۔ آسمانی رنگ کا لباس، ملگجا دوپٹہ اور ہلکی ہلکی خوشبو۔۔۔۔ بہت اچھی معلوم ہو رہی تھیں۔ ہاتھ میں بدستور ایک کتاب تھی۔

”صرف دس منٹ آپ مجھے دے دیجئے۔ یہ دیکھئے تاریخ کی کتاب ہے۔ میں نے اسے ابھی ابھی ختم کیا ہے۔ آپ سوال پوچھئے۔ پورے دس منٹ کے بعد میں چلی جاؤں گی۔“

میں نے کتاب لے لی۔

”اچھا جب بروٹس نے سیزر کو قتل کیا، تو خنجر لگتے ہی سیزر کے مُنہ سے کیا الفاظ نکلے تھے۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

سیزر نے اچھل کر کہا تھا۔۔۔ ”آدو چھ!“

”رچرڈ اوّل نے تخت حاصل کرنے کے بعد پہلا کام کیا کیا؟“

”وہ تخت پر بیٹھ گیا۔“

”اور ۱۹۴۸ء کا مشہور تاریخی واقعہ بیان کرو۔“

”پتہ نہیں، آپ بتایئے کیا ہوا تھا۔“

”تم بتاؤ۔“

”چلئے اس مرتبہ آپ بتا دیجئے۔“

"روضۂ تاج محل مکمل ہوا تھا۔"

"خوب!"

"اور ۱۹۵۸ء میں کیا ہوا؟"

"روضۂ تاج محل کو مکمل ہوئے دس سال گزر چکے تھے۔"

"اور ۱۷۴۸ء میں ؟"

"روضۂ تاج محل کو مکمل ہوئے پورے سو سال گذر چکے تھے!"

اور میں خاموش ہو گیا، سوچنے لگا اب کیا کروں، اس وقت یہ رضیہ بہت ہی پیاری معلوم ہو رہی ہے، اسے دھمکانا بھی بد مذاقی ہے۔ چلو موضوع بدل دیتے ہیں۔

"رضیہ! تم کہیں باہر جا رہی ہو کیا؟"

"ہاں!"

"کہاں بھلا؟"

"حسینہ کے ہاں۔"

"اچھا تو یہ لو دو روپے، ایک کے چاکلیٹ اور ایک کی ٹافی لیتی آنا!"

"آپ بھی ساتھ چلیئے۔"

"نہیں نہیں، آج میں نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ ایمان سے"۔

"تو پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اتنا سا امتحان ہی ہے نا۔ اور آپ نے اسے پہاڑ بنا رکھا ہے۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوں تو ایک لفظ نہ پڑھوں اور اگر آپ کا یہی حال رہا تو پاس ہونا تو در کنار، آپ فیل بھی نہ ہو سکیں گے۔"

رضیہ چلی گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا، اور پڑھنے بیٹھا۔ لیکن رضیہ کا جگمگاتا چہرہ آنکھوں میں ناچ رہا تھا۔ دہ چمکیلے بُندے اور وہ مسکراتی ہوئی شریر آنکھیں۔ میں نے کتاب بند کر دی، صندوق میں سے رضیہ کی تصویریں نکالیں اور دیر تک دیکھتا رہاء میں اس دفعہ ضرور فیل ہو جاؤں گا۔ اور پھر چاروں طرف سے لعنت ملامت ہو گی۔ نہ کوئی کشمیر جانے دے گا نہ کہیں اور۔ اُستاد بھی خفا ہوں گے اور لڑکے بھی یہی کہیں گے کہ جناب کھیلوں کے جمعدار بن کر رہ گئے ہیں۔۔۔۔ پڑھائی میں صفر ہیں۔ لیکن کروں تو کیا کروں۔ عجیب مصیبت ہے۔ اگر یہ رضیہ یہاں نہ ہوتی تو خوب تیاری ہو جاتی اور ضرور پاس ہو جاتا۔

رضیہ واپس آئی۔ مگر خالی ہاتھ۔ سوچا کہ اب اسے ڈانٹیں گے، وہ ٹافی وغیرہ بھول آئی ہے۔

”وہ چاکلیٹ کہاں ہیں؟“

”اوہ! وہ میں نے نہیں خریدے۔ بھلا خریدتی کیونکر؟ آپ نے دو روپے تو دے دیے لیکن یہ نہیں بتایا کہ کون سے روپے کی ٹافی لاؤں اور کون سے روپے کے چاکلیٹ۔“

اور اگلے روز میں جج صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔

”بیٹھو بچّے، کیسی تیاری ہو رہی ہے۔“ وہ بولے۔

”جی ہاں بالکل پڑھائی نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے کہ میں باہر اچھی طرح پڑھ سکوں گا اور میں چاہتا تھا کہ ۔۔۔۔ دیکھئے نا ۔۔۔۔ میں آپ سے اجازت مانگنے آیا ہوں۔ میں جانا چاہتا ہوں ۔۔۔۔۔!“

”کتنی عجیب بات ہے۔“ جج صاحب ناراض ہو کر بولے۔ ”جب بیگم نے مجھ سے کہا تو مجھے یقین نہیں آیا لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ مجھے سچ مچ یقین نہیں آتا۔ آخر تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو۔ مجھے تم سے ہرگز یہ امید نہ تھی۔ چچ چچ۔“

"لیکن یہاں میں ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ اور اگر آپ اجازت دے دیں تو میں آج ہی۔۔۔۔۔"

"دیکھو برخوردار! میں آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں ہرگز پاگل خانے میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔۔۔۔۔!"

"لیکن میری بات بھی تو سنئے۔۔۔۔!"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ روز بروز تمہاری صحت گرتی جا رہی ہے۔ غالباً تم نے ورزش چھوڑ دی ہے۔ اس لیے تمہارے دماغ میں ایسی ایسی باتیں آتی ہیں۔ کل سے تم گھوڑے کی سواری کیا کرو۔"

میں نے واپس آتے ہوئے دیکھا کہ رضیہ پردے کی اوٹ میں کھڑی جھانک رہی ہے۔ یہ گھوڑے کی مصیبت خواہ مخواہ مول لی۔ وہی ہوا کہ نماز بخشوانے گئے تھے اور روزے سر منڈھ دیئے گئے اور پھر جج صاحب کے گھوڑوں سے تو خدا بچائے۔ انہیں تو کسی طرح بھی گھوڑوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کٹکھنے ہیں۔ دولتیاں مارتے ہیں۔ فوراً نیچے پٹخ دیتے ہیں اور بدتمیز بھی ہیں۔

رضیہ نے مجھے آلیا۔ بولی۔۔۔۔ "تو آپ کل سے شہ سواری کیا کریں گے!"

"لیکن میں تو آپ کے گھوڑوں کے پاس بھی نہ پھٹکوں گا۔"

”میں بتاؤں، ایک نہایت شریف اور سیدھا سادہ گھوڑا میری نظر میں ہے۔“

”کہاں ہے؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔

”ویسے مفت میں نہیں ملے گا خریدنا پڑے گا۔“

”لیکن گھوڑا تو میں وہرگز نہیں خرید سکتا۔ آج کل گھوڑا تو کیا میں گدھا بھی نہیں خرید سکتا۔ میرا اسکالر شپ بھی ختم ہو چکا ہے اور جیب خرچ بھی۔“

”بہت سستا مل جائے گا۔“

”کتنے کا؟“

”یہی کوئی پچاس روپے کا۔“

”تو پھر ہو گا وہ کوئی سکینڈ ہینڈ مریل سا بُسا ہوا گھوڑا۔“

”جی نہیں، نہایت مضبوط اور تیز رفتار گھوڑا ہے۔ اس کا رنگ مشکی ہے۔ اس نے بہت سی دوڑیں جیتی ہیں۔“

”تو پھر وہ اندھا ہو گا؟“

”نہیں تو۔“

"کانا ہو گا یا بھینگا ہو گا۔"

"نہیں۔"

"تو پھر وہ لنگڑا تو ضرور ہی ہو گا۔"

"ہر گز نہیں۔"

"تو کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہو گا اس میں۔"

"بس ایک معمولی سا نقص ہے۔"

"کیا؟"

"وہ گھوڑا ویسے تو بالکل ٹھیک ہے فقط ذرا۔۔۔۔!"

"ہاں ہاں فقط ذرا۔۔۔؟"

"ذرا مر گیا ہے۔"

جج صاحب کے کسی دوست کے ہاں تقریب تھی۔ ہمیں مدعو کیا گیا۔ سب وہاں گئے۔ بڑی رونق تھی۔ کئی کنبے آئے ہوئے تھے۔ میں کچھ دیر تو بچوں کے ساتھ کھیلتا رہا پھر دیکھا کہ بال کمرے میں گانا ہو رہا ہے۔ وہاں چلا گیا۔ کوئی صاحب پکّے

راگ گا رہے تھے۔ لوگ باری باری فرمائش کرتے اور گانوں کے نام لیتے۔ مجھے بھی فرمائش کرنے کو کہا گیا۔ مجھے پکّے گانوں کے نام بالکل نہیں آتے۔ فقط ایک نام بھیرویں یاد تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔۔۔۔۔۔ "اچھا قبلہ تو ذرا ہو جائے بھیرویں۔"

انہوں نے ایک عجیب سی سُر میں ایک عجیب سا راگ شروع کر دیا۔ میری نگاہیں پردے پر جم کر رہ گئیں جس کے پیچھے رضیہ کھڑی تھی۔ اب یہ ضرور کوئی شرارت کرے گی۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ یکایک گانا ختم ہو گیا۔

"کیوں حضرت پسند آیا؟" گویّے نے میری طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔

"جی میں نے تو بھیرویں کی درخواست کی تھی۔" میں نے گھبرا کر کہا۔

"یہ بھیرویں ہی تو تھی۔"

"اوہ! اگر یہ بھیرویں تھی تو واہ واہ سبحان اللہ، مرحبا۔ کیا کہنے۔"

اور مجھے اندر بلا لیا گیا چند خواتین مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ ان سے ملا۔ باتیں ہونے لگیں۔ ایک خاتون بولیں۔ "کیوں بیٹا یہ جو تالاب کے پاس پرانی عمارت ہے یہ کتنی پرانی ہو گی۔"

"جی یہ ایک ہزار برس پرانی ہے۔"

"جی نہیں، یہ ایک ہزار چار برس اور ساڑھے تین مہینے پرانی ہے۔" رضیہ بولی۔۔۔۔

"یہ چار برس اور ساڑھے تین مہینے تم کہاں سے لے آئیں۔" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"جب ہم یہاں آئے تھے تو ہم نے سنا تھا کہ یہ عمارت ایک ہزار سال پرانی ہے اور ہمیں یہاں آئے چار برس ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں۔" رضیہ نے کہا۔

رضیہ کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ میں کچھ کھسیانا سا ہو کر باغ میں چلا آیا۔ جو دیکھتا ہوں تو سامنے سے رضیہ چلی آ رہی ہے۔

"ہمیں گھر لے چلئے۔" اس نے مُنہ بنا کر کہا۔

"سب اکٹھے چلیں گے۔"

"نہیں ہمارے سر میں درد ہے اور آپ کو بھی جا کر پڑھنا چاہیے۔"

"ارے! یہ خوب یاد دلایا۔ واقعی مجھے پڑھنا بھی ہے۔۔۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ!"

ہم دونوں واپس لوٹے اور کھانے کی میز پر اس طرح بیٹھے کہ ایک سرے پر میں تھا اور دوسرے سرے پر رضیہ۔ نوکر نے کھانا چُن دیا اور کچھ لینے باہر چلا گیا۔

"ذرا پانی تو پلایئے۔" رضیہ بولی۔

اور مجھے غصّہ آ گیا۔ "خدا جانے اس لڑکی نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ اس سے کم از کم تین سال بڑا ہوں گا"۔

"خود اُٹھ کر پی لو۔"

"آپ ہی لا دیجئے۔ معمولی سا کام ہے۔ آپ تو ناحق تکلّف کرتے ہیں۔"

"میں ہر گز نہیں اُٹھوں گا۔ پینا ہے تو خود پی لو۔" میں نے جھلّا کر کہا۔

"اچھا میں آنکھیں بند کرتی ہوں، اتنے میں آپ چپ چاپ لے آیئے۔"

"دیکھو رضیہ، اگر تم نے دوبارہ پانی وانی کا ذکر کیا تو میں ۔۔۔۔ تو میں آ کر تمہارے کان کھینچ لوں گا۔"

"اچھا، جب آپ کان کھینچنے آئیں تو ایک گلاس پانی لیتے آئیں۔"

اگلے روز میں پکچر دیکھنے گیا۔ پہلے سوچا تھا کہ رضیہ کو ساتھ لے چلیں۔ اتنی پیاری لڑکی ساتھ ہو تو ہم جماعتوں پر زبردست رعب پڑتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ ہم

جماعت تو سب کے سب امتحان کے پھیر میں ہیں اور رضیہ وہاں بھی تنگ کرے گی۔ چنانچہ میں چپ چاپ اکیلا ہی چلا گیا۔

ابھی تھوڑی سی فلم گزری ہو گی کہ کسی نے پچھلی سیٹ سے کہا ”ذرا سیدھے ہو کر بیٹھئے جناب، مجھے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔“

میں سیدھا ہو گیا۔۔۔۔ پھر آواز آئی۔۔۔۔ ”اپنے کان ذرا نیچے کر لیجئے اور گردن میں زور سے خم ڈالیے تا کہ میں اچھی طرح دیکھ سکوں۔“

”میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔۔۔ ارے! یہ رضیہ تھی؟“

”تم کیسے آئیں؟“

”ہم چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ یا ہمیں راستہ نہیں معلوم یا ہمیں اکیلے آتے ڈر لگتا ہے؟“

”یہاں آ جاؤ“۔ میں نے رسمی طور پر یہ کہہ دیا اور وہ سچ مچ میرے ساتھ آ بیٹھی۔

”ارے یہ آپ کا جوتا تو بہت چمک رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے نیا لیا ہے۔ آپ کو یہ جوتا کتنے کو پڑا۔“

اور جب ہم واپس جا رہے تھے تو شوفر نے پیچھے مڑ کر کہا۔ ''صاحب پیٹرول ختم ہو گیا ہے۔ راستے میں لے لوں کیا؟''

''لے لو''۔۔۔۔ میں بولا۔

''ارے بھئی چلے چلو۔ رات کے وقت پٹرول کون پوچھتا ہے۔'' رضیہ نے کہا۔

انہی دنوں ہمارے ہاں چند مہمان آ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد سب کے سب باغ میں چبوترے پر بیٹھے تھے۔ رضیہ بھی بیٹھی تھی۔ میں حیران تھا کہ یہ اتنی دیر سے بالکل خاموش کیونکر ہے۔ میرے امتحان کا ذکر آیا۔ رضیہ بولی۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ یہ نہایت اچھے جواب مضمون لکھتے ہیں۔'' جواب مضمون تو ایک طرف رہا میں نے کبھی سوال مضمون تک نہیں لکھا تھا۔

''سچ مچ؟ ہم ضرور سُنیں گے۔'' مہمانوں میں سے کوئی بولے۔

''ان کا ایک تازہ جواب مضمون میرے پاس ہے۔''

''ضرور، ضرور!''

رضیہ اندر سے ایک کاپی اُٹھا لائی۔

۔۔۔۔۔۔ ”ویسے یہ ساراجواب مضمون تو سُنایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ خاصا طویل ہے، البتہ اس کے چند حصّے سُناتی ہوں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے۔ سُنئے۔۔۔۔۔۔ لکھتے ہیں کہ۔۔۔۔۔۔ سورج مشرق میں غروب ہو رہا تھا۔ اچھی طرح غروب ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ غروب ہو کر پھر غوطہ لگا کر واپس اوپر آ جاتا تھا۔ اسی طرح آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔ میں نے غروبِ آفتاب کو غور سے دیکھا۔ سورج کو اٹھکیلیاں کرتے دیکھ کر مجھے سخت بھوک لگی۔ پھر میں نے سوچا کہ بہرا کیا چاہیے دو آنکھیں!“

”لاحول ولا قوۃ!“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”اور جب میں اندھیرے میں واپس آ رہا تھا تو مجھے میرا عزیز دوست ملا جس کے پاس ایک ٹارچ تھی۔۔۔۔۔۔ اس نے ٹارچ جلائی اور آسمان کی جانب رُخ کر دیا۔ فضا میں روشنی کی ایک لکیر بن گئی۔ وہ بولا تم بڑے سراغرساں بنے پھرتے ہو۔ جب جانیں جب روشنی کی اس لکیر کو پکڑ کر آسمان پر چڑھ جاؤ۔ میں کچھ دیر تو سوچتا رہا۔ پھر مُسکرا کر بولا۔ کسی اور کو بیوقوف بنانا۔ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ تم کیا کرو گے۔ جب میں لکیر پکڑ کر اوپر چڑھ رہا ہوں گا تو تم ٹارچ بجھا دو گے اور میں دھڑام سے نیچے آ گروں گا۔“

”بے حد زٹیل مضمون ہے بھئی۔ اسے مضمون کون کہہ سکتا ہے۔“ آواز آئی۔

یہ تحریر ہرگز میری نہیں تھی۔ نہ جانے رضیہ کیا پڑھ رہی تھی۔

"اچھا اب ایک اور حصّہ ہے جس میں ہیرو ایک خونی کا تعاقب کرتا ہے۔ لکھتے ہیں۔۔۔ جب میں نے اسے مکان سے نکلتے دیکھا تو فوراً اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ میرے ساتھ میرا سراغرساں دوست بھی تھا۔ ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے کئی میل گئے۔ اس نے تانگہ لیا، ہم نے بھی تانگا کر لیا۔ وہ موٹر میں بیٹھ گیا۔ ہم بھی ایک اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ ہماری جیبوں میں بھرا پستول اور ہتھکڑیاں تھیں اور وہ خونی خالی ہاتھ تھا۔ خیر وہ سٹیشن پر پہنچا۔ ہم بھی پیچھے پیچھے سٹیشن پر پہنچے۔ ریل آئی ہم ایک ہی ڈبّے میں سوار ہو گئے۔ ہماری نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ تین دن اور تین رات ہم نے ٹرین میں اس کا پیچھا کیا۔ آخر وہ ایک جگہ اُتر گیا۔ ہم بھی ساتھ اترے۔ اس نے جہاز کا رُخ کیا۔ ہم نے بھی پیچھا نہ چھوڑا، آخر وہ جہاز میں سوار ہو کر چل دیا اور ہم سمندر کے کنارے سے اسے دیکھتے رہے۔ کچھ دیر ہم خاموش رہے پھر میں نے چونک کر اپنے دوست سے کہا۔۔۔ ارے! بھئی اگر ہم اسے گرفتار کر لیتے تو بہتر ہوتا، افوہ! خیال نہیں رہا، میرا دوست بولا۔۔۔۔"

"لاحول ولا قوۃ، یہ تو کچھ بھی نہیں بھئی! بڑا واہیات مضمون ہے۔"

"اور یہ ڈرامہ بھی کرتے ہیں، پچھلے سال انہوں نے ایک ڈرامہ کیا تھا جس میں ان کا پارٹ بالکل مختصر تھا۔ صرف سٹیج پر آ کر یہ کہنا تھا۔ یور ایکسیلنسی! ساتھ کے کمرے میں ایک پچاس سال کا بوڑھا شخص بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ارشاد ہو تو حاضر کروں۔ اور اس کے لیے یہ ہفتوں تک ریہرسل کرتے رہے۔ جب اسٹیج پر آئے تو سب سے پہلے ان کی دہنی مونچھ گر پڑی، جسے انہوں نے فوراً اٹھا کر لگا لیا۔ پھر یہ بڑی بلند آواز سے بولے۔ یور ایکسیلنسی! ساتھ کے کمرے میں ایک پچاس سال کا بوڑھا شخص بیٹھا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ارشاد ہو تو حاضر کروں۔۔۔۔ اور مجمع سے بہت سی آواز آئیں۔۔۔۔ ضرور حاضر کیجیے، ضرور بلایئے صاحب۔"

"میں ڈرامیٹک کلب کا سیکرٹری ہوں۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"جی ہاں! یہ ڈرامیٹک کلب کے جوائنٹ اسوشئٹ اسسٹنٹ آرنریری سیکرٹری ہیں۔" رضیہ بولی۔

"میں نے ہمیشہ اہم ترین رول ادا کیے ہیں۔" میں نے اپنی مدافعت کرتے ہوئے کہا۔

"مثلاً؟"

"مثلاً یہی کہ رومیو جولیٹ میں میں رومیو بنا تھا۔"

"اور وامق عذرا میں؟" رضیہ نے پوچھا۔

"وامق!"

"اور شیریں فرہاد میں؟"

"فرہاد!"

"اور فاتح بنگال میں؟"

"بنگال!" میرے مُنہ سے نکل گیا۔ اور جو قہقہے لگے ہیں تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔

اب امتحان میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ میری حالت عجیب تھی۔ غصّہ بھی آتا تھا۔ افسوس بھی، اپنے اوپر ہنسی بھی آتی تھی، رضیہ سچ مچ میرے ساتھ زیادتی کر رہی تھی۔ سراسر زیادتی اور وہ بھی اس حالت میں جبکہ میں بے بس تھا۔ بڑے غور و خوض کے بعد میں نے ایک تدبیر سوچی۔۔۔۔ فرض کیا میں رضیہ کو

رشوت دیدوں۔ شاید اُسے کُچھ ترس آ جائے۔ میں نے اپنا بٹوہ دیکھا۔ کُل چالیس روپے تھے۔ سیدھا بازار پہنچا۔ ایک دکاندار سے کہا کہ کوئی اچھا سا تحفہ دکھاؤ۔

"کسے دیجئے گا؟" سوال ہوا۔

"ایک دوست کو!"

"خاتون ہیں یا۔۔۔!"

"خاتون ہیں!"

"کیا لگتی ہیں آپ کی؟۔۔۔ گستاخی معاف!"

"کچھ نہیں لگتیں۔۔۔!"

"کیا یہ اُمّید ہے کہ کبھی کچھ لگنے لگیں گی؟"۔۔۔ دکاندار نے جرح جاری رکھی۔ میں ابھی جواب سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بول اُٹھا۔۔۔ "اوہ۔۔۔ سمجھ گیا تو یہ بات ہے۔ کیا عمر ہو گی ان کی۔ معاف کیجئے!"

"ہم عمر ہیں۔"

"اور وہ۔۔۔؟"

"جو تمہیں کہا ہے وہ کرو۔ سوال مت پوچھو۔"

"تو صاحب اس صورت میں تو انگوٹھی سب سے اچھی رہے گی۔ میرے پاس بہت سی اعلیٰ درجے کی انگوٹھیاں ہیں۔۔۔۔ یہ دیکھئے،۔۔۔۔۔!"

مجھے ایک انگوٹھی پسند آگئی۔ نہایت خوبصورت تھی۔ قیمت دریافت کی تو معلوم ہوا پچاس روپے کی ہے۔ میں ہچکچانے لگا اور دوسری انگوٹھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا، غالباً دکاندار بھانپ گیا۔

"کوئی خیال نہ فرمایئے۔ باقی روپے پھر بھجوا دیجئے۔" اور میں انگوٹھی لے آیا۔ اب آگے ہمّت نہ پڑتی تھی۔ آج تک رضیہ کو کوئی تحفہ نہیں دیا تھا۔ پتہ نہیں وہ رشوت قبول بھی کرے گی یا نہیں، اور جو اس نے رشوت قبول کر لی تو نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی اور نئی نئی فرمائشوں سے جان عذاب میں آجائے گی۔ پھر سوچا کہ امتحان ختم ہوتے ہی گھر چلا جاؤں۔ اور اب لے آیا ہوں تو پاس رکھنا بے کار ہے۔ آخر امتحان میں صرف ایک رات باقی رہ گئی ہے۔ انگوٹھی ضرور دے دینی چاہیے۔ میں نے اُسے گھر میں ڈھونڈا، نہیں ملی۔ باغ میں مل گئی۔ پھول چُننے جا رہے تھے، میں نے بُلایا۔

"رضیہ میں ایک چیز لایا ہوں تمہارے لیے۔" میں نے انگوٹھی نکالتے ہوئے کہا۔

"کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟؟؟" اس نے پھول نیچے رکھ دیے۔

اور میں نے انگوٹھی اس کے سامنے چمکا دی۔۔۔ "دیکھ لو یہ تمہیں ٹھیک آتی ہے یا نہیں۔ میں نے تو یونہی اندازاً چُن لی تھی۔"

ارے یہ کیا؟۔۔۔ میں حیران رہ گیا، رضیہ سنجیدہ کیوں بن گئی۔

"تم خود دیکھ لو۔" میں نے انگوٹھی اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ "اور تم چپ کیوں ہو۔"

وہ کچھ دیر گم سم کھڑی رہی اور پھر اس نے پلکیں اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ اتنی گہری نگاہوں سے شاید پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔۔۔ اور مجھے بھی کبھی وہ اس قدر حسین معلوم نہیں ہوئی تھی۔

"تو خود پہنا دیجئے۔" اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"بھئی اب خود ہی پہن لو تم۔" میں کچھ گھبرا سا گیا۔

"نہیں آپ پہنایئے۔"

"اچھا!"

"اوں ہوں۔ اس انگلی میں نہیں، اس میں" میں نے پہنا دی۔

اور وہ چُپ چاپ میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ یہ سچ مچ وہی رضیہ ہے۔ اور اتنی سی دیر میں اسے کیا ہو گیا ہے۔۔۔ نظریں نیچی ہیں۔ دوپٹہ سر پر آگیا ہے۔ سمٹی سمٹائی کھڑی ہے، عجب تماشا ہے، کیسی عجیب لڑکی ہے؟

"ارے! تمہاری انگلی سے خون نکل رہا ہے۔" میں نے اس کی انگلی پکڑتے ہوئے کہا۔ "کہیں کانٹا چُبھ گیا تھا کیا؟"

اُس نے آہستہ ہاتھ جھٹک دیا اور بولی۔۔۔ "آپ کی بلا سے۔" چشمِ زدن میں رضیہ وہاں سے غائب تھی۔

"آپ کی بلا سے۔" یہ الفاظ کس قدر شیریں لہجے میں کہے گئے تھے۔ کس قدر پیار، ملائمت اور ترنّم تھا ان میں۔"

میں نے دہرایا۔۔۔ "آپ کی بلا سے۔"

رات بھر میں نے ایک لفظ نہ پڑھا، نہ مجھے نیند ہی آئی۔ رات بھر میرے کانوں میں یہی ایک فقرہ گونجتا رہا۔ چاند نکلا۔ بُلبُل نے اپنا نغمہ چھیڑا۔۔ آواز آئی۔ "آپ کی بلا سے۔"

اور صبح صبح میں کمرہ امتحان میں بیٹھا تھا۔ پرچہ میرے سامنے رکھا تھا جس میں چھ سوال تھے، ہر سوال کی عبارت تھی۔۔ آپ کی بلا سے۔ میں نے خدا جانے پرچے میں کیا لکھا اور کیا نہیں لکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک فقرہ میں نے کئی جگہ لکھ دیا تھا۔۔۔۔ اور وہ فقرہ تھا۔۔۔۔ "آپ کی بلا سے۔"

اور جب میں واپس آیا تو رضیہ میری منتظر تھی آسمانی رنگ کا لباس پہنے جو مجھے بہت بے حد پسند تھا۔ اس نے کتنے پیار بھرے لہجے میں پرچے کے متعلق پوچھا، دلاسا دیا۔ ہمّت بندھائی۔ اس روز میں نے محسوس کیا کہ سچ مچ حسین، لڑکیاں ہمیشہ ہمدرد اور مہربان ہوتی ہیں۔

ہر شام کو ہم سیر کرنے جاتے۔ راستے میں رضیہ ایسی پیاری پیاری باتیں کرتی کہ میں حیران رہ جاتا کہ کیا سچ مچ یہ وہی رضیہ ہے؟ اور اس میں اچانک اتنی بڑی

تبدیلی کیوں کر آ گئی۔ وہ انگوٹھی ہر وقت پہنے رہتی اور اس طرح اُسے دیکھتی جیسے اس چیز پر اُسے بے انتہا فخر ہے۔

پھر امتحان ختم ہونے سے چند روز پہلے میں نے اُسے اپنے ساتھ اسی دُکان پر لایا۔ اب میری جیب گرم تھی، میں مالدار تھا، اُسی دکاندار نے جب رضیہ کو میرے ساتھ دیکھا تو اس قدر خوش ہوا جس کی کوئی حد نہیں، اور اس نے چپکے سے مجھے مبارکباد بھی دی۔ میں نے رضیہ سے کہا کہ کوئی اچھا سا تحفہ اپنے لئے پسند کر لو۔ لیکن اُس نے جواب دیا۔۔۔ ''جب مجھے انگوٹھی مل گئی تو اب کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔'' اور میں دیر تک یہی سوچتا رہا کہ آخر انگھوٹھی میں کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہیں۔ جو اسے اس قدر اہمیت دی جارہی ہے۔ آخر کیا ہے اس میں؟ معمولی سی چیز ہے۔ اگر اس روز دکاندار نہ کہتا تو شاید میں اسے خرید تا ہی نہ، کچھ اور لے آتا۔۔۔

اگلے ہفتہ میں کشمیر چلا گیا۔ چند روز تو انگوٹھی اور رضیہ دونوں کا خیال رہا، پھر سب کچھ بھول گیا۔

اور اب۔۔۔ اس امتحان میں جبکہ میں بالکل اکیلا تھا، اب مجھے اپنا وہ امتحان بہت یاد آیا، چند سال پہلے کا امتحان اور رضیہ بھی بہت یاد آئی۔ اب مجھے معلوم تھا کہ رضیہ نے اس تحفے کو اس قدر سنجیدگی سے کیوں لیا تھا؟

امتحان کے دنوں میں رضیہ نے بڑی شرارتیں کی تھیں۔ مجھے بہت چھیڑا تھا۔ چڑایا تھا، تنگ کیا تھا، خوب ستایا تھا۔ لیکن اسے انگوٹھی پہنا کر میں نے بڑی زیادتی کی تھی۔

ہماری فلمیں

ہماری فلموں سے مراد وہ فلمیں ہیں جو سودیشی ہیں۔ جن میں ہماری روزانہ زندگی کے نقشے کھینچے جاتے ہیں۔ جن میں ہماری برائیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری فلموں نے اتنے تھوڑے سے عرصے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ چند ہی سال کی بات ہے کہ یہاں نہایت مضحکہ انگیز فلمیں بنتی تھیں جن کے خیال سے ہم شرمندہ ہو جاتے ہیں اور ہماری پیشانی پر پانچ چھ قطرے پسینے کے آ جاتے ہیں۔ لیکن اب خدا کے فضل سے ایسی فلمیں بننے لگی ہیں جن پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔ اب ڈنڈے مار فلموں کا زمانہ گیا۔ بادشاہوں کے محلوں اور سنیاسیوں کے غاروں سے اب کیمرے کا رُخ ایک معمولی خاندان کے گھر کی جانب ہو گیا ہے۔ اب ہماری فلمیں ہماری روزانہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ہم اس ترقی پر یقیناً بہت خوش ہیں۔ بعض اوقات ہم تنہائی میں مسکرانے لگتے ہیں اور دیر تک مسکراتے رہتے ہیں۔ مسرت سے ہماری باچھیں کھل جاتی ہیں فخر سے ہمارا سینہ تن جاتا ہے۔ یہ سب

کچھ ہونے کے باوجود بعض اوقات کچھ عجیب سے خیالات ہمارے دل میں آتے ہیں۔ ہم بہت کوشش کرتے ہیں کہ اس الجھن سے باہر نکل آئیں لیکن مجبور ہو کر الٹی سیدھی باتیں سوچنے بیٹھ جاتے ہیں۔

پہل تو ہم اپنے پروڈیوسر حضرات کی دریادلی پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک فلم خدا جانے کتنی لمبی ہوتی ہے۔ شاید کئی میل لمبی، اور جب ٹریلر دیکھتے ہیں تو قریب قریب ساری فلمی کہانی سُن لیتے ہیں۔ ٹریلر کے بعد فلم دیکھنا محض اُسے دہرانا ہے۔

ایک اور بات جو ہمیں ایسی فلمیں دیکھنے کے بعد معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ جب محبت ہوتی ہو تو یوں منٹوں میں ہو جاتی ہے اور ایک ہفتہ کے اندر اندر دونوں کا برا حال ہو جاتا ہے اب اس معاملے میں ہمیں کوئی ذاتی تجربہ تو ہے نہیں لیکن یہ ضرور سنا ہے کہ اصلی محبت ہونے میں کم از کم چھ ماہ سے ایک سال تک کا عرصہ لگتا ہے۔

لیکن یہاں انکشاف ہوتا ہے کہ محبت کے لیے فقط ایک چیز ضروری ہے اور وہ ہے ایک لڑکے اور لڑکی کی ملاقات۔ شام کو اگر لڑکا سینما گیا تو لڑکی ضرور وہیں ملے گی اور اگر لڑکی سرکس گئی تو لڑکا ضرور وہیں ہو گا۔ اگلے روز لڑکے کو تار ملے گا کہ فوراً گھر پہنچو، ریل کے ڈبے میں بیٹھتے ہی اسے پتہ چلے گا کہ اتفاق سے لڑکی

بھی اسی ڈبے میں بیٹھی ہے۔ راستے میں ان کے صندوق بدل جائیں گے۔ پھر ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو لڑکا وہیں کہیں کسی آفت سے بچا لے گا۔ اور وہ شخص لازمی طور پر اس لڑکی کا والد ہو گا۔ اور جب لڑکی کے والد تک معاملہ پہنچ جائے تو سمجھ لیجئے کہ اب شادی ہو کر رہے گی۔ اس قسم کے حادثات ہوتے رہیں گے حتیٰ کہ دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ شادی کے بعد حادثے بالکل بند ہو جائیں گے اور دنیا میں سکون آجائے گا۔

اور ساتھ ہی ایک اور گہرے راز کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس ملک میں وہی شخص محبت کر سکتا ہے جو بہت اچھا گاتا ہو۔ جسے گانا نہ آتا ہو اس شخص کو اتنا بھی حق حاصل نہیں کہ محبت کے متعلق کچھ سوچے بھی۔ البتہ وہ کوشش کرے تو ولن کا کام کر سکتا ہے۔ دو محبت کے متوالے دلوں کے بیچ میں ٹانگ اڑا سکتا ہے بس!

اب سوچے تو سہی کہ ایک حسین خاتون (جن سے آپ محبت کرنے پر تُلے ہوئے ہیں) ایک چھوٹی سی بلّی یا تتلی کو دیکھ کر مسرور ہوتی ہیں کہ فوراً فی البدیہہ نظم کہہ کر اُسے گانے لگتی ہے۔ لازماً آپ کو کسی درخت کی آڑ میں وکٹ کیپر کی طرح جھکے ہوئے تاک لگائے کھڑا ہونا چاہیے۔ تو اس وقت آپ کا پریم تبھی ظاہر ہو گا جب آپ ایک ہاتھ لہرا کر نعرہ لگائیں اور گانا شروع کر دیں۔

اور آپ ان کے گاتے ہی فوراً کسی جھاڑی کے پیچھے سے نکل نہیں آتے یا کسی درخت سے دھم سے کود نہیں پڑتے اور اگر آپ فی البدیہہ اشعار نہیں کہہ سکتے اور فوراً ہی دو گانے میں شامل نہیں ہو سکتے تو خاطر جمع رکھئے کہ آپ ہر گز ہر گز پریم کے حقدار نہیں۔

آپ کو چاہیے کہ چوبیس گھنٹے ان کی کوٹھی کا پہرہ دیں اور اسی تاک میں رہیں کہ وہ خاتون کسی وقت اپنے کمرے میں یا اپنے باغ میں یا باورچی خانے میں یا سیڑھیوں پر۔۔۔۔۔خوش ہو کر گانا شروع کرتی ہیں۔ بس یہ سنہری موقع ہے۔ آپ بلند آواز سے جواباً گانا شروع کر دیجئے۔ چاند پر ایک بدلی آ جائے گی۔ بُلبُلیں چہچہانے لگیں گی (اگر وہ سوئی پڑی ہیں تو انہیں اُٹھنا پڑے گا) ان خاتون کے گھر تمام افراد کے کانوں پر مہریں لگ جائیں گی۔ سب کے سب اس وقت تک بہرے رہیں گے جب تک آپ دونوں گانے کا شغل ختم نہیں کرتے۔

اگر وہ لوگ چونکیں گے تو آپ کے گانے سے نہیں بلکہ آپ کی سرگوشیوں سے، یا اگر آپ اپنے کمرے میں بیٹھے ان کی یاد میں گا رہے ہیں (بلکہ رو رہے ہیں)۔ آپ کا نوکر کمرے میں چائے لائے تو چپ چاپ واپس چلا جائے گا یا پھر جاتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو ہوں گے۔ آپ کا پیارا کتّا فرش پر بیٹھا ہوا

زار و قطار رو رہا ہو گا۔ باہر ٹہنیوں پر بیٹھے ہوئے غمگین پرندے چٹاخ پٹان زمین پر گرتے ہوں گے اور گرتے ہی دم نکل جاتا ہو گا۔

دیکھتے دیکھتے بادل امڈ آئیں گے۔ بجلیاں کوندنے لگیں گی۔ یکلخت موسلا دھار بارش شروع ہو جائے گی اور آپ کا جنون دُگنا ہو جائے گا۔ آپ یکایک چلّا چلّا کر گانا شروع کر دیں گے، پھر یکلخت ایک فلک شگاف دھماکہ ہو گا۔ آپ سہم کر رہ جائیں گے۔ ایک سادھو بارش میں بھیگتا ہوا مستانہ آواز میں گاتا جا رہا ہو گا۔ آپ اسے لچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں گے۔ آپ کے سامنے آ کر تو وہ بالکل آہستہ آہستہ چلنے لگے گا۔ تب تک بجلیاں نہیں کڑکیں گی۔ بارش بھی دھیمی پڑ جائے گی۔ جونہی اس نے گانا ختم کیا ایک دم بادل جاگ اُٹھیں گے، دھڑام چٹاخ۔۔۔۔پٹاخ شروع ہو جائے گی۔

اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے ہاں ولین سے بہت بے انصافی کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہال کا ہال لٹھ لے کر پیچھے پڑ جاتا ہے، ذرا ولین نظر آیا اور گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

"مارو خبیث کو۔۔۔۔!"

"ناہنجار، بد بخت !۔۔۔۔ فلاں کا پٹھّا۔۔۔ بد تمیز !"

"ہاتھ پیر توڑ ڈالو کمبخت کے ؟"

دراصل ہمیں ولین ایک نہایت ہی ڈراؤنی چیز دکھائی جاتی ہے۔ جس میں دنیا بھر کے عیب ہوتے ہیں اور ولین کا ہوّا لوگوں کے دلوں میں اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ فلم میں ولین بالکل نہ ہو۔ فقط ہیرو ہیروئن ہوں، ان کے والدین، ایک دو مسخرے اور چند نیک چال چلن والے آدمی ہوں بس! جب ولین کی مرمت ہوتی ہے تو ہر شخص کا دل مسرت سے رقص کرنے لگتا ہے اور ولین کیا مجال جو ذرا سی بھی مدافعت پیش کرتا ہو۔ ہٹا کٹا ولین ایک مرے ہوئے ہیرو سے مار کھاتا رہتا ہے۔

اور پھر پرندوں کا ایک جوڑا بھی عرصے سے ہمارے سینوں پر مونگ دل رہا ہے۔ آندھی ہو، طوفان ہو، بجلیاں کڑکیں، اولے پڑیں، پرندوں کا کم از کم ایک جوڑا ضرور ٹہنی سے چپکا ہو گا۔ دونوں پرندے ایک دوسرے کو پیار کر رہے ہوں گے اور دل ہی دل میں قدرت کے ان ڈراؤوں پر ہنس رہے ہوں گے کہ یہ کیا چھچھوری کوششیں ہمیں اڑانے کے لیے کی جا رہی ہیں۔

اور اسی موقع پر وہیں ہیرو اور ہیروئن بارش میں کھڑے بھیگ رہے ہوں گے۔ ان کے نزدیک گھنے درخت بھی ہوں گے، کوئی دالان بھی ہو گا لیکن توبہ کیجئے بس بھیگنا جو ہوا۔ دالان میں کھڑے ہو کر تو ہر کوئی محبت کر سکتا ہے۔ مزہ ہے کہ محبت بارش میں بھیگ کر کی جائے اور پھر کہیں پرندوں کا جوڑا بھی ٹہنی پر بیٹھا بھیگ رہا ہو تو زہے قسمت۔

اگر ہیروئن اکیلی کھڑی بھیگ رہی ہے تو وہ ضرور بھاگے گی، اور ہیروئن اسی موقع پر سیدھی کبھی نہیں بھاگتی۔ ہمیشہ لمبے سے لمبا اور مشکل ترین راستہ اختیار کرے گی۔ راستے سے دور کوئی درخت کھڑا ہے یہ ضرور دوڑ کر اس میں ٹکر مارے گی۔ اگر ٹھوکر کے لیے پتھر نہیں ملتا تو تلاش کر کے کوئی پتھر ضرور ڈھونڈے گی اور پھر دھڑام سے گر پڑے گی۔

ادھر لوگوں کو شروع سے آخر تک یہی انتظار رہتا ہے کہ ان کی شادی کب ہوتی ہے۔ ہیرو ہیروئن کی، اُستاد اور استانی کی، ہیرو کے دوست اور ہیروئن کی سہیلی کی۔

بیچ میں مشکلات آتی ہیں، مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔ لیکن شادی کا پروگرام بدستور صحیح رہتا ہے، اگر ہیرو آسٹریلیا چلا گیا اور ہیروئن تبّت چلی گئی اور دور کہیں پہاڑوں میں چھپ کر جوگن بن گئی تو بھی دنیا کی کوئی طاقت انہیں شادی کرنے سے باز

نہیں رکھ سکتی۔ کسی نہ کسی دن ایک ہوائی جہاز آئے گا جس میں ہیرو بیٹھا ہو گا اور اس ہوائی جہاز کا پٹرول عین اُس پہاڑ پر ختم ہو گا۔ جہاں ہیروئن بیٹھی پوجا کر رہی ہو گی۔ ہوائی جہاز دھڑام سے گرے گا۔ باقی سب انّا اللہ ہو جائیں گے فقط ہیرو بچ جائے گا اور شادی ہو جائے گی۔ ہمارے ہاں ہر پانچ سو کامڈی کے بعد ایک ٹریجڈی بھی بنتی ہے اور اس میں یہ ہوتا ہے کہ یا تو ہیروئن کے ابّا کا انتقال ہو جاتا ہے (ہیرو کی جان بچاتے ہوئے) یا ہیرو کی محبوبہ نمبر دو ہلاک ہو جاتی ہے (وہ بھی ہیرو کی جان بچاتے ہوئے) کیونکہ ہیرو کا زندہ رہنا فلم کی جان ہے۔ یا یوں کہ ہیرو ہیروئن میں سے شادی کے بعد ایک رحلت کر جاتا ہے۔ عموماً ہیروئن کیونکہ اس کی صحت محبت سے کمزور ہو جاتی ہے۔ پھر ہیرو چیخیں مارتا ہے، پتھروں اور درختوں سے دل کی باتیں کہتا ہے، بطخوں کو پکڑ پکڑ کر ان سے باتیں کرتا ہے، بکریوں کے سامنے روتا ہے، اونٹوں کی قطار دیکھ کر وہ بے اوسان ہو جاتا ہے اور ہیروئن کو یاد کرتا ہوا ریگستان نکل جاتا ہے۔

پھر اتنے میں ایک سادھو (جو دیر سے انتظار میں بیٹھا ہے) ایک دردناک گانا گاتا ہوا ایک جھیل کی سامنے سے گزرتا ہے۔ جھیل میں اس کا سایہ پڑ رہا ہے، دور کہیں سورج غروب ہو رہا ہے، لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں میں تشنج آ جاتا ہے۔

لیکن ایک بات کی تسلّی رہتی ہے۔۔۔۔ آخر شادی تو ہو گئی تھی نا۔

ایکٹروں کی صحت کے متعلق ہمیں بڑا فکر رہتا ہے، ہمارے ڈائریکٹر حضرات بے حد انتہا پسند ہیں۔ یا تو ہمیں تپ دق کے مارے ہیرو دکھائے جاتے ہیں یا ایسے جیسے بورار کھا ہو۔ اب ان دونوں قسم کے حضرات کو کوئی حق نہیں کہ وہ محبت کے پاس بھی پھٹکیں کیونکہ اس طرح ہمارے جذبات کا خون ہو جاتا ہے۔

سینما دیکھتے وقت محبت کے متعلق ہمارے خیالات بڑے لطیف ہوتے ہیں۔ ذرا سی ناگوار بات سے صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے اگر ہم ایک بھاری بھر کم گینڈے کو ہیرو کے روپ میں دیکھیں جو ایک موٹی تازی ہیروئن سے عشق کا دعوےٰ رکھتا ہو تو ذرا اندازہ لگائیے کیا حال ہو گا ہمارا۔

ہیرو صاحب ہیروئن کے کمرے میں کھڑے بڑی سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں۔ ''ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جُدا نہیں کر سکتی۔ ہم سماج کو کچل دیں گے۔ دنیا اگر ہم پر ہنستی ہے تو بے شک ہنسے۔ ہم یہ کہہ دیں گے وہ کر دیں گے۔'' ساتھ ساتھ وہ اپنی نوخیز توند پر ہاتھ پھیرتے جاتے ہیں تو اس وقت ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں۔

عجیب سی بات ہے کہ لوگ موٹے تازے آدمیوں کو محبّت سے مستثنےٰ قرار دیتے ہیں۔ وہ یہ تصوّر میں لا ہی نہیں سکتے کہ ایک انسان جس کا دوران ڈھائی مَن سے زیادہ ہو، جس کی دو ٹھوڑیاں ہوں، جس کی توند طلوع ہو رہی ہو، اس کے دل میں بھی محبت کا جذبہ سما سکتا ہے۔ عموماً یہی سوچا جاتا ہے کہ اس سائز اور اس نمبر کے آدمی ہمیشہ کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تپ دِق کے مارے ہوئے ہیرو بھی دوائیوں کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ اسی زد میں عورتیں بھی آ سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک فربہ خاتون کو سریلی آواز میں دردناک گانا گاتے دیکھ کر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے اور دل میں یہی خیال آتا ہے کہ اب یہ گانا گا کر فوراً ایک بھاری سا ناشتا تناول فرمائیں گی اور چند ڈکاریں لینے کے بعد مزے سے سو جائیں گی۔ علی الصبح ان کے میز پر دودھ کے دو لمبے لمبے گلاس بھرے ہونگے۔

بعض اوقات ہمارے دل میں باغیانہ خیالات کی گھڑ دوڑ ہونے لگتی ہے۔ ہم سوچنے لگتے ہیں کہ آخر کیوں ہمیں خوبصورت جسم والے ایکٹر ہیں دکھائے جاتے، واجی صحت والی ہیروئنیں اور پیارے بچّے، یہ سب کہاں ہیں؟

کیا ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ بے تکے ہیرو، گلگلے جیسی ہیروئن اور کالے کلوتے بسورتے ہوئے بچّے دیکھیں۔ اگر یہی ہے تو ہمیں اپنی قسمت سے ہمدردی ہے۔

اب رہ گیا فلموں کی لڑائی کے متعلّق۔ میں نے شاید پہلے عرض کیا تھا (اگر میں بھول گیا ہوں تو اب سُن لیجئے) کہ ہم ڈنڈے مار فلموں کا ذکر نہیں کر رہا۔ بہترین ہندوستانی فلموں کے متعلّق لکھ رہا ہوں۔ سو ایک بات کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ یہ کہ ہمارے ہیرو ولین کو محض دھکیل ہی کیوں دیتے ہیں۔ مکّہ یا تھپّڑ کیوں نہیں مارتے۔ اگر انہیں ولین کے جذبات کا بہت خیال رہتا ہے تو پھر دھکیلنا بھی فضول سی بات لگتی ہے، کچھ بھی نہ کہا کریں۔ دیکھئے نا ایک بڑا دہشت ناک سین ہے۔ ایک طرف ہیروئن بھیگی بلّی بنی کھڑی ہے۔ اس کے ساتھ ولین کھڑا اُسے دھمکا رہا ہے۔ ہیرو آجاتا ہے (وہ عموماً مصیبت کے وقت آجایا کرتا ہے، اس کی عادت ہے) دیکھتے ہی اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے، نتھنے پھول جاتے ہیں، پاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں، لوگ مشتاق ہیں کہ دیکھئے اب ولین کا کیا حال ہو گا۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ہیرو آگے بڑھ کر ولین کو ایک طرف دھکیل دیتا ہے تو ان کی تمام امنگوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

اُدھر ولین اس صدمے سے اس قدر نڈھال ہو جاتا ہے کہ اُٹھ نہیں سکتا۔ نہ ہیرو سے لڑنے کی جرات کر سکتا ہے۔ بس وہیں چپ چاپ لیٹا رہتا ہے یا چپکے سے باہر چلا جاتا ہے۔

اور اگر لڑائی ہوتی بھی ہے تو یوں کہ ادھر سے ہیرو دھکیلنا شروع کرتا ہے تو ولین کو دوسری دیوار تک لے جاتا ہے۔ پھر اس کی باری آئی ہے اور وہ دھکیلتا دھکیلتا ہیرو کو اُدھر سے لے آتا ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کے سب منتظر ہوتے ہیں۔

بعض اوقات ایک اور قسم کی لڑائی دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک جگہ بہت سے آدمی کھڑے ہیں یکایک سب کے سب پستول نکال لیتے ہیں۔ ہیرو ولین کو نشانہ بناتا ہے۔ ولین فوراً ہیرو کی طرف پستول کا رُخ کر دیتا ہے، وہ گھوڑا دباتا ہے لیکن گولی ہیرو کے برابر سے نکل جاتی ہے اور ایک اور شخص خواہ مخواہ مر جاتا ہے ولین گرتے گرتے ہیروئن کے چچازاد بھائی کو مار ڈالتا ہے اور وہ کسی اور کو، ہیروئن بھی کئی حضرات کو ہلاک کر دیتی ہے۔ اس کے بعد جو دھمادھم ہوتی ہے تو چاروں طرف دھواں ہی دھواں چھا جاتا ہے اور جب مطلع صاف ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ہیرو اور ہیروئن زندہ کھڑے ہیں اور باقی سب لوگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر، وکیل اور تھانہ دار سب ہماری فلم کی جان ہیں۔ جس فلم میں ایک آپریشن، ایک عدالت کا سین اور ایک گرفتاری عمل میں نہیں لائی جاتی، اسے بہت کم لوگ پسند کرتے ہیں۔

لیکن فلموں کا ڈاکٹر آل راؤنڈر ہوتا ہے یعنی ہاتھ میں نشتر، گلے میں ربڑ کی نلکی، سر پر ہیڈ مرر اور دیوار پر بینائی ٹسٹ کرنے کے حروف۔ اب بتایئے یہ سب چیزیں ایک ہی شخص ایک ہی کمرے میں کیونکر استعمال کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر کا محبوب فقرہ یہ ہے۔۔۔۔ "حالت نازک ہے، دماغی صدمہ پہنچا ہے، اگر ایسا ہی صدمہ دوبارہ پہنچایا جا سکے تو یہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے یا ہو جائیں گی۔" اس کے بعد ڈاکٹر دماغ کا آپریشن کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ ایسا آپریشن جو بڑے بڑے تجربہ کار سرجن نہیں کر سکتے۔

ایک خطرے سے ہم آگاہ کیے دیتے ہیں کہ اگر فلم میں کوئی ایسا سین آ جائے جہاں فضا میں سکون ہو، وہ پرندے (ہمارے پرانے دوست) بیٹھے ہوں، سورج نکل رہا ہو یا ڈوب رہا ہو اور ہوا چل رہی ہو تو سمجھ لیجیے کی ضرور کوئی نہ کوئی گا دے گا۔ کسی نہ کسی ایکٹر کو بیٹھے بٹھائے درد اُٹھے گا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ آپے سے باہر ہو جائے گا۔ اس وقت دنیا کی کوئی طاقت اُسے گانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔

اور کچھ نہیں تو فوراً وہی ہمارا دیرینہ رفیق ایک سادھو گاتا ہوا سامنے سے گزر جائے گا۔

اور یہ لاٹری کی علّت بھی کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آئی، فلم میں جہاں کہیں ہیرو لاٹری کا ٹکٹ لے لے بس فوراً سمجھ لیجئے کہ یہ صاحب تین چار لاکھ یوں وصول کر لیں گے۔ یہ یک طرفہ کاروائی ہمیں بالکل پسند نہیں۔

یا تو یوں ہو کہ فلم کے تمام ایکٹروں کو لاٹری کے ٹکٹ خریدتے دکھایا جائے اور پھر کسی ایک کے نام انعام نکل آئے تو کوئی بات بھی ہوئی۔

لیکن صاحب جو سب سے غریب ہوتا ہے اسے کوئی مجبور کر کے ایک ٹکٹ دلوا دیتا ہے اور یکلخت وہ امیر ہو جاتا ہے اور بیوی بچوں کو چھوڑ چھاڑ کر بمبئی یا لاہور بھاگ جاتا ہے۔ وہاں سارا روپیہ خرچ کر کے اندھا یا کانا ہو کر واپس آ جاتا ہے۔ آتے ہی اس کی بیوی فوراً اسے معاف کر دیتی ہے اور ایک ڈاکٹر آپریشن کر کے اس کا دماغ یا آنکھیں درست کر دیتا ہے اور جہاں سے یہ قصّہ شروع ہوا تھا وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

اور زمینداروں کے متعلق لگاتار فلمیں دیکھ دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ زمیندار ایک نہایت رومانی ہستی ہے جس کا کام صبح سے شام تک شعر و شاعری

اور محبت کرنا ہے۔ کپاس کے کھیتوں میں عشق کی گھاتیں ہوتی ہیں۔ چرواہے بیلوں اور بھینسوں کے پاس بیٹھ کر محبوب کی یاد میں بانسری بجاتے ہیں۔ ہر ہل چلانے والا ایک زبردست گویّا ہوتا ہے جو چوبیس گھنٹے گاتا ہی رہتا ہے۔

زمیندار کے لڑکے کا فرض ہے کہ وہ ضرور کسی سے محبت کرے اور زمیندار کا فرض ہے کہ وہ پہلے تو تفریحاً ناراضگی ظاہر کرے اور پھر شادی پر رضامند ہو جائے۔ لیکن ہمارے ایک زمیندار دوست نے جب ہمیں مدعو کیا اور ہم ایک عرصے تک ان کی حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بھی کوئی مشکوک بات برآمد نہ کر سکے تو ہماری امیدوں کا خون ہو گیا۔

ہیروئن کی شادی ہو رہی ہے لیکن غلط آدمی کے ساتھ، ہیرو یا تو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ یا کہیں دوسری جگہ ہے۔ لوگ بے چین ہو رہے ہیں۔ ولین بڑا خوش ہے۔ ہیروئن رو رہی ہے (بعض اوقات ایسے موقعوں پر ہیروئن گانے سے بھی نہیں چوکتی) یکلخت ایک آدمی دوڑتا ہوا آتا ہے اور چلّا کر کہتا ہے۔ ''ٹھہرو!'' اس کے پیچھے پیچھے پولیس کا ایک افسر اور چند سپاہی ہیں جو فوراً ولین کو گرفتار کر لیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے میں بے قصور ہوں۔ جواب ملتا ہے کہ یہ عدالت میں کہنا۔

عموماً ہیرو پولیس کے ساتھ آیا کرتا ہے لیکن بعض اوقات اِدھر اُدھر سے بھی برآمد ہو جاتا ہے۔ ہیروئن کے ابّا اسے اشارہ کر دیتے ہیں کہ جلد ہاتھ مُنہ دھو کر آجاؤ۔

ادھر جو براتی ولین کے ساتھ آئے تھے وہ سوچتے ہیں کہ چلو شادی ہی میں جانا تھا، خواہ کسی کی ہو۔ چنانچہ وہ وہیں بیٹھے رہتے ہیں۔

پھر رومن وقتوں کا سین دکھایا جا رہا ہے۔ چند لوگوں نے رومن لباس پہن رکھا ہے، باقیوں نے نیکریں اور پتلونیں پہن رکھی ہیں، چند حضرات چھتریاں لگائے پھر رہے ہیں۔ ایک دروازے میں سے کچھ اُونٹ چلے جا رہے ہیں، ایک صاحب کے بال انگریزی تراش کے ہیں۔ ذرا غور کرنے پر کسی بازار میں بجلی کا کھمبا، کسی مکان پر کبوتروں کی چھتری اور کسی درخت کی آڑ میں مسجد کا مینار ضرور مل جائے گا۔ یا یوں کہ سن انیس سو ایک کا واقعہ دکھایا جا رہا ہے اور دیوار پر کیلنڈر لگا ہوا ہے سن انیس سو بیالیس کا۔

فرہاد صاحب نہایت دردناک لہجے میں گا رہے ہیں، لوگ الف لیلوی انداز کے کپڑے پہنے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ دور ایک چمکیلی سی کار گزر جاتی ہے۔ مہا بھارت کے زمانے کی ہیروئن کی کلائی پر اتفاق سے گھڑی بندھی ہوئی ہے اور اُس کے بال "پوم" ہوئے ہوئے ہیں۔

اگر کوئی ایکٹر کسی ایکٹر سے کوئی راز کی اصلیت پوچھنا چاہے کہ "بھئی بتادو وہ بات کیا ہے؟" (یا کیا تھی) اور دوسرا ایکٹر کہے "ذرا ٹھیرو ابھی بتاتا ہوں"۔۔۔ یا "ذرا سے انتظار کے بعد سب کچھ معلوم ہو جائے گا"۔ تو سمجھ لیجئے کہ اس ایکٹر کا مطلب ہے کہ "بھیا ابھی جلدی کیا ہے ذرا دو تین رِیل اور گزر جانے پھر بتائیں گے۔ اگر جلدی جلدی باتیں بتائی گئیں تو پھر فلم چھوٹی سی رہ جائے گی۔"

اب آخر میں ہم چند پر اسرار باتوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو ہمارے لیے معمّوں سے کم نہیں۔ ہم چاہیں جتنا سوچیں لیکن ان گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتے۔ مثلاً جب ہیرو ایک برس جنگل میں رہتا ہے جہاں اس کے کپڑے پھٹ جاتے ہیں۔ کھانے کے لیے بندروں سے دھینگا مشتی کر کے پھل مہیا کرتا ہے تب ہر روز علی الصبح اس کی حجامت کون کر جاتا ہے؟ جب وہ صبح صبح اُٹھ کر تیرتا ہے تو اس کا چہرہ آئینے کی طرح صاف ہوتا ہے۔

اور پھر یہ کہ جب کبھی پندرہ یا سولہ برس گزرتے دکھائے جاتے ہیں۔ ایک دھند سی پردے پر آجاتی ہے۔ سین بدلنے پر ہم دیکھتے ہیں کہ اتنے طویل عرصے نے کسی ایکٹر کی صحت پر ذرا سا اثر نہیں کیا۔ ہیرو پہلے سے بھی زیادہ چست ہے۔ ہیروئن پہلے سے کہیں چاق و چوبند ہے۔ اُن کے والدین بھی ہو بہو ویسے ہی ہیں۔ بلکہ پہلے سے کچھ تندرست ہی ہیں۔ یہ سین دیکھ کر ہم سوچتے

رہتے ہیں کہ ان لوگوں نے پندرہ سال تک وہ کون سا ٹانک استعمال کیا ہو گا۔ کاش کہ ایسے وقت اس ٹانک کا نام بھی بتا دیا جائے۔

اور جب کردار خودکشی کرنے جاتے ہیں تو چپ چاپ کیوں نہیں جاتے۔ گاتے ہوئے کیوں جاتے ہیں اور ایک خاتون جو آٹھ دس برس سے ہیرو پر مفتون ہیں یکلخت کسی اور خاتون کو ہیرو کے ساتھ دیکھ کر اپنے حقوق کیوں بخش دیتی ہیں؟۔۔۔ اور ساتھی ہے یہ کیوں فرما دیتی ہیں کہ آج سے ہیرو ان کا بھائی ہے۔ اسی طرح ہیرو بعض اوقات اچھی بھلی محبوبہ کو بہن کیوں بنا ڈالتا ہے؟

آخر میں ہم پھر عرض کئے دیتے ہیں کہ ہم اپنی فلموں کی حیرت انگیز ترقی پر بڑے مسرور ہیں۔ ہمیں ان پر فخر ہے۔ بعض اوقات ہم مغرور بھی ہو جاتے ہیں اور دیر تک مغرور رہتے ہیں۔ اور بعض اوقات ہمارے دل میں عجیب سے خیالات آنے لگتے ہیں۔ یہ عارضی ہوتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد بخارات بن کر اُڑ جاتے ہیں۔ اور ہم پھر اپنی فلموں کے دلکش تصوّر میں کھو جاتے ہیں۔

شکایتیں

رات کے نو بجے ہوں گے۔ ایک لمبے سے کمرے میں ایک لڑکا کرسی پر بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا ہے۔ دور کونے میں ایک لڑکی بیٹھی کچھ لکھ رہی ہے۔ ایک طرف دو پلنگ بچھے ہیں جن پر دو بچّے لیٹے ہوئے ہیں۔

نعیم: (رضائی میں سے سر نکال کر) آپا ستارہ! تم سوال کیوں نہیں نکالتیں؟

ستارہ: (تکیے پر کہنی رکھ کر) شیطان کہیں کا! بڑوں کا نام لیا کرتے ہیں کہیں؟

نعیم: اور امّی جو ہر وقت تمہیں ستارہ ستارہ کہتی رہتی ہیں۔

ستارہ: ان کا کیا ہے۔ وہ تو بڑی ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو تجھے کیا؟

نعیم: کل امّی جان کہہ رہی تھیں استانی نے آپ کی شکایت لکھ کر بھیجی ہے کہ ستارہ حساب میں بہت کمزور ہے۔

ستارہ: پھر وہی نام لیا۔ تو جغرافیہ کیوں نہیں پڑھتا؟ فیل ہو کر دھرا جائے گا۔ جب دیکھو درنگے لگاتا پھرتا ہے۔ جبھی تو پندرہ پندرہ نمبر آتے ہیں۔ ہر مضمون میں ہر مرتبہ سکول سے خراب رپورٹ آتی ہے۔

نعیم: امّی کہہ رہی تھیں کہ تم دونوں کے لیے ایک اُستاد رکھوں گی۔

ستارہ: ہوں، اُستاد رکھیں گی۔ امّی کی بڑی چلائی۔ پچھلے امتحان میں انگریزی میں پچھتّر نمبر کیوں نہیں آئے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ سب مضمونوں میں ایک سا ہوشیار ہوا ہے۔

نعیم: تو آپا اتنا کمزور تو میں بھی نہیں جتنا امّی سمجھتی ہیں۔ سالانہ امتحان میں تو پاس ہو جاتا ہوں۔ پرسوں کا ذکر ہے کہ ہمارے سکول کے سکاؤٹ لڑکے ایک روز کے لیے باہر جا رہے تھے۔ میں نے امّی سے اجازت مانگی تو جھٹ سے ڈانٹ دیا کہ اتنا سا لڑکا ہے ابھی سے سیر سپاٹے سوجھتے ہیں۔ اتنے لڑکوں کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہاں کون سے ڈاکو بیٹھے تھے جو مجھے اٹھا کر لے جاتے۔ بچّہ تو ہوں نہیں، چھٹی جماعت میں ہوں۔ ویسے ڈانٹنا تو امّی کی عادت ہی ہے۔

ستارہ: خیر! یہ تو کوئی بات بھی تھی۔ مگر میں نے جہاں امّی سے دہلیز سے باہر نکلنے کی اجازت مانگی شامت آگئی۔ روز سنتے ہیں کہ آج نمائش ہے، آج عورتوں کا جلسہ ہے۔ آج فلاں سینما میں بڑا اچھا تماشا ہے میری ہم جماعتیں ہر جگہ جاتی ہیں مگر کیا مجال جو امّی کبھی چوکھٹ سے باہر قدم نکالنے دیتی ہوں۔ آخر تنگ آکر میں نے پوچھنا ہی چھوڑ دیا۔ تیرا کیا ہے تو تو پھر بھی بھیّا کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

نعیم: اجی جیسا جاتا ہوں بس میرا دل ہی جانتا ہے۔ کبھی اجازت ملتی ہے تو حکم ہوتا ہے کہ شریف کو ساتھ لے جاؤ۔ نام کو شریف کہلاتا ہے مگر ہے پورا بدمعاش۔ راستے میں کوئی نئی چیز نظر آگئی اور اس نے ٹھنک ٹھنک کر ناک میں دم کر ڈالا۔ کیا مجال جو وہاں سے ہل بھی جائے۔ اٹھا اسے نہیں سکتا پورا، بورے کا بورا ہے۔ پچھلے ہفتے میں کرکٹ کا سامان لایا تھا بس شریف صاحب دیکھتے ہی مچل گئے اور لگے بسورنے کہ یہ سب کچھ میرے حوالے کر دو۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ یہ چیزیں کلب کی ہیں میری نہیں۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر امّی نے الٹا مجھے ہی دھمکایا کہ گھر میں ایسی چیزیں کیوں لاتا ہے۔ جس سے بچّے کا جی للچانے لگے۔ یہ کہہ کر سب کچھ پھینک کر بولیں کہ جاؤ دفع ہو، ڈال لے انہیں جیب

میں، بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بچّے کا دل للچانے لگے۔۔۔۔۔ ہونہہ، آیا بڑا بچّہ کہیں کا؟۔۔۔۔۔ یہ شریف کیا لگتا ہے ہمارا؟

ستارہ: بھانجا ہوگا۔ بڑی آپا کا لڑکا ہے۔

نعیم: کیا عمر ہوگی اس کی؟

ستارہ: مجھے تو پتہ نہیں۔

نعیم: بھیّا سے پوچھ لوں؟

ستارہ: پوچھ لے۔

نعیم: بھیّا!

سلیم: (ناول پڑھتے ہوئے) ہوں۔

نعیم: یہ جو بڑی آپا کا چھوٹا سا ننھا ہے نا، یہ کتنے سال کا ہے؟

سلیم: (غصے سے) گدھے نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ یونہی الل ٹپ باتیں کئے جائے گا۔ پہلے سوال کرنے تو سیکھ۔ بھلا چھوٹا سا ننھا کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ لفظ ننھا خود ظاہر کر رہا ہے کہ جس چیز کا ذکر ہو رہا ہے وہ ایک چھوٹا سا بچّہ ہے۔ خبردار جواب کے ڈسٹرب کیا تو۔

ثریّا: (لکھنا بند کر کے) پانچ چھ برس کا تو ہے ہی۔ کیا تم شریف کی برائیاں کر رہے ہو؟ اگر آپا نے سُن لیا تو شامت آجائے گی۔

(تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے)

ستارہ: (نعیم سے) امّی ایک دن مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ شریف کو اپنا سکول دکھالاؤ۔ بھلا ایسے نمونے کون ساتھ لے جائے۔ جناب کا حلیہ ایسا ہوتا ہے جیسے برسوں سے کسی نے نہیں نہلایا۔ کپڑے بھی مٹّی میں لُتھڑے ہوئے۔ نہ تمیز ہے نہ عقل اور گھروں کے بچّے بھی دیکھے ہیں مگر ایسا بدتمیز بچّہ کہیں نہیں دیکھا۔ امّی کے لاڈ نے بگاڑ رکھا ہے۔ اسے تو مفت میں سر پر چڑھا رکھا ہے۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے پھر بھی کپڑے ایسے ہوتے ہیں کہ گھِن آتی ہے۔

نعیم: کپڑے ہمارے بھی کون سے اچھے ہوتے ہیں؟

ستارہ: میری سہیلیوں کو لو۔ سعیدہ ایسی بنی سنوری رہتی ہے کہ کیا بتاؤں! عفّت جہاں بھی بیٹھ جائے سب کچھ مہک اُٹھتا ہے۔ بملا ہر تیسرے روز نئی ساڑی بدل کر آتی ہے۔ یہاں ذرا کسی نئے کپڑے کی فرمائش کی اور پھر اللہ دے اور بندہ لے، اتنی بُری طرح سے امّی جھاڑتی ہیں کہ بس!

ابھی سے رنگین کپڑے پہن کر کہاں چلی؟ نئے نئے ولولے اُٹھ رہے ہیں۔ ہم نے بھی دن گزارے ہیں۔ یہ ہے اور وہ ہے (آہستہ سے) آپا ثریّا کے لئے ہر مہینے دو چار جوڑے نئے سِل کر آتے ہیں۔

نعیم: اور بھیّا سلیم کے پاس بھی بیسیوں سوٹ ہوں گے۔ طرح طرح کے تیل، قسم قسم کی کریمیں، خدا جانے کیا الا بلا ان کے پاس ہے۔ جب صبح حجامت کرنے بیٹھتے ہیں تو دکان سی لگ جاتی ہے۔ اور آپا ثریا کا کمرہ تو پورا بساط خانہ ہے۔ ان کا کیا ہے وہ تو کالج بھی تانگے پر جاتی ہیں۔ بھیّا بھی سائیکل پر چلے جاتے ہیں اور آپا تمہارے لئے بھی لاری آجاتی ہے۔ مگر خدا جانے مجھ سے کون سا قصور ہوا ہے کہ مجھے پیدل جانا پڑتا ہے۔ اب تو خیر سردیاں ہیں۔ گرمی کے دنوں میں دوپہر کے وقت سکول سے واپس آتے وقت پتہ چلتا ہے۔ میرے لئے ایک سائیکل بھی نہیں جڑتی۔ کوئی پرانی سی سائیکل ہی لے دیں۔ ابّا تو کہتے ہیں کہ آٹھویں جماعت میں سائیکل لے دیں گے مگر امّی جان ہمیشہ یہی کہتی ہیں کہ یہ عمر پیدل چلنے پھرنے کی ہے ابھی سے سائیکل پر چڑھنے لگا تو بڑھاپے میں کیا کرے گا۔ ابھی سے بڑھاپے کی فکر پڑ گئی۔ خیر! مگر آپا تانگے میں کیوں جاتی ہیں۔ یہ بھی تو آرام طلبی ہے اور ویسے تانگا ہوتا بھی خالی ہے۔ آپا اکیلی جاتی ہیں۔ کیا ہوا اگر ہمیں بھی ساتھ لے لیا کریں۔

سلیم: (سن لیتا ہے) میاں تمہاری قسمت! میں نے تو امّی سے بہتیرا کہا ہے کہ ثریّا کے ساتھ تم دونوں کو بھیج دیا کریں۔ مگر وہ مانتی ہی نہیں۔ کہتی ہیں کہ دونوں کے سکول شہر کے دوسرے سِرے پر ہیں اگر ساتھ بھیجا تو قباحت رہے گی۔ دراصل بات یہ ہے کہ امّی جان کو خود بھی تو اپنی سہیلیوں کے پاس جانا ہوتا ہے۔

ثریا: یہ کمبخت تانگہ کیا ہوا کوئی عجوبہ ہو گیا۔ جو آتا ہے تانگا مانگ کر لے جاتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے مہینے میں بیس روز تو یہ باہر مانگا تانگا گیا ہوتا ہے۔ مجھے دوسری لڑکیوں کے ساتھ جانا پڑتا ہے۔ مفت کی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے اور احسان الگ سر چڑھتا ہے۔ امّی جان کی سہیلیاں تقریباً تقریباً ہر گلی کوچے میں موجود ہیں۔ آج اُسے تانگا چاہیے، کل اسے چاہیے۔ (لکھنے لگتی ہے)

نعیم: (ستارہ سے) آپا تم تو پھر بھی لاری سے جاتی ہو۔

ستارہ: اللہ ماری لاری ہے یا بلیک ہول۔ چاروں طرف سے ایسے گھٹ کر جاتے ہیں جیسے قیدی جا رہے ہوں اور لڑکیاں اس قدر ٹھنسی ہوئی ہوتی ہیں کہ جسم سُن ہو جاتا ہے۔ بازاروں میں طرح طرح کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں۔ کہیں تماشا ہو رہا ہے تو کہیں بینڈ بج رہا ہے مگر کیا مجال جو ذرا بھی

جھانک سکیں۔ ذرا گردن موڑی اور وہ کمبخت بڑھیا ایسے دیدے گھماتی ہے کہ جان نکل جاتی ہے۔ تُو پیدل جاتا ہے۔ راستے میں تماشے دیکھتا ہو گا۔

نعیم: یہ تماشے بھی زہر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ دو میل آنا جانا پڑتا ہے۔ کوئی جا کر تو دیکھے ایسی ورزش ہو جاتی ہے کہ کیا کہوں۔ جب چھٹی ہوتی ہے تو سب لڑکے خوش ہوتے ہیں مگر مجھے یہاں تک آنا پہاڑ دکھائی دیتا ہے۔ (کچھ سوچ کر) ہماری سُنتا ہی کون ہے۔ اصل میں ہم چھوٹے ہیں نا؟

سلیم: (ناول ایک طرف ہٹا کر) اور بڑے کون سے راج کر رہے ہیں۔۔۔ امّی جان کی حکمرانی ہم پر ویسی ہی ہے جیسی تم پر۔ کل میں نئے ریکارڈ لایا تھا کیوں ثریا؟ (ثریا سر ہلاتی ہے) شامت نے جو پکارا تو چند فلمی ریکارڈ بھی لے آیا۔ اب جو امّی ناراض ہوئی ہیں تو خدا کی پناہ۔ کہنے لگیں کہ ان ریکارڈوں کو دیا سلائی دکھا دو۔ سڑک پر پھینک آؤ۔ نگوڑے ریکارڈ میں نہ جانے کیا الّم غلّم بھرا ہوا ہے۔ نہ اللہ کا نام نہ رسول کا کلمہ۔ اگر ریکارڈ ہی لانے تھے تو نعتیہ کیوں نہ لائے۔ لو بتاؤ بھلا میں قوّالیاں لاتا یا مرثیے لاتا۔ سب دوستوں کے یہاں ریڈیو لگے ہوئے ہیں۔ میں دو سال سے

زور دے رہا ہوں۔ ابّا ایک دفعہ مان بھی گئے تھے مگر امّی نے سُنی ان سُنی کر دی۔

ثریا: ایک طرح تو اچھا ہی ہوا۔ اگر ریڈیو آ بھی جاتا تو اسے یہاں ٹکنے کون دیتا۔ امّی کی پانچ چھ درجن سہیلیوں کو خدا سلامت رکھے۔ ان کے طفیل سے ریڈیو بیچارہ بھی ہر روز ایک نیا گھر دیکھتا۔

سلیم: کوئی ایک بات ہو تو کہیں۔ ابھی چند روز گزرے کہ بیٹھک میں میرے کچھ دوست آ گئے۔ ہم عمر لڑکے ملیں گے۔ آخر کو ہنسیں بولیں گے۔ ان کے جانے کے بعد امّی نے مجھے بُلا کر کہا۔ کون تھے یہ لفنگے دو گھنٹے تک دھما چوکڑی مچائے رکھی۔ تو بھی ان کے ساتھ مل کر ویسا ہی ہو گیا۔ نہ معلوم اس قدر پابندیاں کیوں عائد کی گئی ہیں۔ گرمیوں میں ساری دنیا کشمیر جاتی ہے۔ میرے پچاسوں ہم جماعت کشمیر گئے اور ادھر ہم ہیں کہ لُو چلے آندھی آئے مچھر کاٹیں۔ رات کو حبس ہو جائے مگر ساری چھٹیاں لازمی طور پر گھر ہی کاٹی جائیں۔ اگر کچھ روز کے لیے باہر چلے گئے تو پھر امّی جان کے طعنے ہیں، سیلانی ہے۔ خانہ بدوشی کو جی چاہتا ہے۔ گھر کیسے بسائے گا؟

ثریا: بھیّا! پھر بھی آپ بڑے ہیں۔ امّی آپ کا لحاظ کرتی ہیں۔

سلیم: جی ایسے لحاظ سے تو بے لحاظ ہی اچھے۔ اگر سینما جانا ہو تو سارا کنبہ ساتھ چلے، دوستوں کے ساتھ ذرا باہر دیر ہو گئی تو وکیلوں کی طرح جرح شروع ہو جاتی ہے۔ کہاں گئے تھے؟ کیوں گئے تھے؟ اب تو نہیں جاؤ گے؟ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں اور امّی جان تانگے میں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک ہم جماعت لڑکی مل گئی۔ اسے سلام کر دیا۔ آخر ساتھ پڑھتے ہیں۔ امّی نے گھر آکر مجھے اتنا ڈانٹا جس کی کوئی حد نہ حساب۔ بھلا کوئی ناراض ہونے کی بات ہے؟ پھر کئی روز تک انہوں نے مجھ سے بات تک نہ کی۔۔۔ میں تو تنگ آگیا ہوں اس ہر وقت کی قید سے۔ اس دفعہ بی اے کا امتحان پاس کر لوں پھر اگر گھر میں رہ جاؤں تو نام بدل دینا۔ ہوسٹل میں رہوں گا۔

ثریا: میری سہیلیوں میں امّی جان کو ایک بھی پسند نہیں۔ ہر ایک میں طرح طرح کے نقص نکالتی رہتی ہیں۔ یہ چنچل ہے، یہ اکل کھری ہے، چھچھوری ہے۔ یہ بدتمیز ہے۔ اس کی والدہ کے دماغ میں فتور ہے۔۔۔ بھلا دماغ تو والدہ کا خراب لڑکی میں کیا خرابی نکل آئی؟ ویسے بھی لڑکیوں کا پہنا امّی کو اچھا نہیں لگتا۔ رنگ برنگے کپڑے کیوں پہنتی ہیں؟ برقعے ایسے باریک اور شوخ کیوں ہوتے ہیں؟ کنوارپنے میں زیور کس نے بتایا؟ خوشبو کیوں لگاتی ہیں؟ میں دسویں جماعت میں پاس ہوئی تو

سہیلیوں نے مبارک باد دی اور کہنے لگیں کہ پارٹی دو۔ میں نے امّی سے کہا وہ رضامند تو ہو گئیں مگر اس شرط پر کہ اسے پارٹی نہ کہا جائے بلکہ دعوت کہا جائے اور دوسرے یہ کہ میں کلثوم کو نہ بلاؤں۔

سلیم: (کلثوم کے نام سے چونک پڑتا ہے) کیا کہا کلثوم کو۔۔۔۔۔۔ کلثوم کو کیوں نہ بلایا جائے؟

ثریا: خدا جانے کیوں امّی کو بری لگتی ہے۔ خیر پارٹی ہوئی۔ میں نے چوری چھپے کلثوم کو بُلا لیا۔ بھلا لڑکیوں میں کیسے پتا چل سکتا تھا

سلیم: (مسکراتے ہوئے) خوب! گویا بلا ہی لیا تم نے اسے۔

ثریا: وہ بات بھی آئی گئی ہوئی۔ پچھلے ہفتہ کا ذکر ہے کہ نمائش میں مَیں نے ایسے اچھے بُندے دیکھے کہ کیا کہوں۔ میں نے امّی سے کہا۔ وہ بولیں کہ۔۔۔۔

سلیم: (بات کاٹتے ہوئے) یہ کلثوم کلاس میں کیسی ہے؟ ہے تو شوخ۔ کیا خاک پڑھتی ہو گی۔ مجھے تو کُند ذہن سی دکھائی دیتی ہے۔

ثریا: نچلی تو بیٹھتی ہی نہیں۔ بوٹی بوٹی تھرکتی رہتی ہے۔ یہ توڑ پھوڑ، اسے ستا، اُسے چھیڑ، غرض لڑکی کیا ہے چھلاوہ ہے۔ فسٹ ائیر میں پڑھتی ہے مگر

اونچی جماعتوں کی لڑکیاں بھی اسی سے پناہ مانگتی ہیں۔ اور یہ ہے کہ کیا مجال جو کسی کا لحاظ بھی کر جائے۔ خیر! ہمیں کیا، آپ بھگتیں گے اس کے گھر والے۔ ہاں تو بھیّا میں نے ان بُندوں کا ذکر امّی سے کیا۔۔۔۔ جڑاؤ تھے اور کام بھی ان پر بہت اچھا اور سبک تھا۔

سلیم: پھر شکل و صورت ہی کون سی اچھی ہے۔ چینیوں کا سا رنگ، لمبوترا چہرہ، قد بھی یونہی لمبا سا۔ دُور سے ایسی لگتی ہے جیسے چھڑی ہلتی ہوئی آ رہی ہو۔

ثریا: توبہ بھیّا! اتنا بھی مت گراؤ بچاری کو۔ ہماری جماعت میں تو سب سے اچھی ہے اور ویسے بھی کالج کی خوبصورت لڑکیوں میں گنی جاتی ہے۔

سلیم: مگر ان کی حالت مجھے کچھ ایسی اچھی نہیں لگتی۔ اس کا چھوٹا بھائی موٹر لے کر آیا کرتا ہے نا؟ کیا بیہودہ موٹر ہے۔ بالکل بنا بنایا چھکڑا ہے۔ کمبخت قبل از مسیح کی معلوم ہوتی ہے۔ ضرور ٹیکسلا کی کھدائی سے برآمد ہوئی ہو گی۔ پوچھنا تو سہی کبھی۔

ثریا: کہہ رہی تھی کہ اب نئی موٹر لیں گی۔ گھر سے، اچھے بھلے ہیں۔ جائداد بھی ہے۔ کاروبار بھی کرتے ہیں۔ ملازمت بھی ہے۔ ہاں تو میں بُندوں کا ذکر کر رہی تھی۔۔۔۔

سلیم: وہ اس کا چھوٹا بھائی کتنا جھڑوس ہے، نویں جماعت میں پڑھتا ہے شاید۔ بالکل مریل سا ہے۔

ثریا: بچّہ ہی تو ہے ابھی، لے دے کے دو بہن بھائی ہیں۔ ماں باپ بڑا لاڈ کرتے ہیں۔ اس لاڈ نے تو کلثوم کو بگاڑ رکھا ہے۔

سلیم: مگر ثریا یہ تمہارے پاس اس کی اتنی چیزیں کہاں سے آ گئیں۔ ہر ہفتے کبھی رومال آ رہے ہیں، کبھی کتابیں، کبھی کچھ۔

ثریا: آپ ہی بھیج دیتی ہے۔ میں کیا کروں۔ ایک دن کہنے لگی تمہارے بھائی انگلش میں کیسے ہیں؟

(سلیم ایک دم چونک کر ناول ایک طرف رکھ دیتا ہے)

سلیم: (بے صبر ہو کر) پھر تم نے کیا کہا؟

ثریا: میں نے کہا اپنی کلاس میں اوّل آتے ہیں۔

سلیم: پھر وہ کیا بولی؟

ثریا: کہنے لگی جب سالانہ امتحان ہو گا تو میری کمپوزیشن انہیں دکھا دیا کرنا۔

سلیم: (دل میں خوش ہو کر) اونہہ مجھے بھلا بڑی فرصت ہے جو کمپوزیشن دیکھا کروں گا۔ نا بابا۔ بخشو مجھے اپنی ہی پڑھائی سے کہاں چھٹکارا ملتا ہے کہ لوگوں کو پڑھاتا پھروں، تم نے کہہ نہیں دیا۔

ثریا: ایک روز اس کی کاپی میں آپ کو تصویر رکھی تھی۔

سلیم: (اچھل کر) میری تصویر؟

سلیم: ٹیم کا گروپ فوٹو تھا۔ کسی اخبار سے کاٹا ہوا تھا!

سلیم: تم نے چھین کیوں نہ لی؟ سبحان اللہ! اچھا لاڈ ہے۔ واہ! یہ بھی خوب رہی، جان نہ پہچان بڑی خالی سلام۔

ثریا: جب آپ بیمار تھے تو ہر روز آپ کے لیے کتابیں لایا کرتی تھی۔ معلوم ہے کہاں سے لاتی تھی؟

سلیم: کہاں سے؟

ثریا: کلثوم کے ہاں سے لایا کرتی تھی۔ وہ خود ہی دے جایا کرتی تھی۔ ہر دوسرے تیسرے روز پوچھا کرتی تھی کہ تمہارے بھائی اب کیسے ہیں؟ ایک دن کہنے لگی کہ میرے ڈاکٹر چچا دہلی سے آئے ہوئے ہیں کہو تو انہیں بھیج دوں۔

سلیم: پھر۔۔۔۔۔؟

ثریا: میں نے انکار کر دیا۔ امّی جان کو تو اس کی پرچھائیں بھی زہر دکھائی دیتی ہے۔

سلیم: یہ امّی جان کی بھی خوب چلائی۔ ہر بات میں۔

(بڑی آپا اندر داخل ہوتی ہے)

آپا: (ایسے جیسے سب کچھ سن لیا ہے) کلثوم کا ذکر ہو رہا تھا۔ خوب! یہ کلثوم کیا ہوئی چھلاوا ہو گئی۔ جہاں جاؤ اسی کے تذکرے ہیں۔

سلیم: (خوشامد سے) نہیں تو آپا ویسے ہی اتفاقیہ ذکر آ گیا تھا ورنہ ہمیں اس سے کیا۔

آپا: تمہیں اس سے کیا؟ صاحبزادے! ذرا ہوش کے ناخن لو۔ میں تھوڑی بہت تو تم سے بڑی ہوں۔ جب وہ کم بخت امّی کو اتنی بُری لگتی ہے تو تم دونوں بہن بھائی اس پر کیوں جان چھڑکتے ہو۔ اتنے خود سرے ہو کر جاؤ گے کہاں آخر؟ ان ثریابی کا تو اس سے اتنا پیار ہے۔ اتنی گاڑھی چھنتی ہے کہ منٹ بھر کی جدائی گوارا نہیں۔ ہر وقت اسی کی مالا جپتی ہے۔ توبہ! توبہ! کلثوم بھی کوئی لڑکی ہے۔ ایسی چنچل لڑکی کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہ سر کا ہوش ہے نہ دوپٹے کا خیال، ہر وقت ترنگ میں رہتی ہے۔ اور جب وہ امّی کو ناپسند ہے تو۔۔۔؟

سلیم: (جھنجھلا کر) امّی! امّی! امّی! آپا یہ بات بات میں امّی کیوں دخل دیتی ہے؟ اگر نعیم اور ستارہ کو کہا کریں تو کوئی بات بھی ہوئی، مگر ہمیں۔۔۔ بھلا ہم کوئی بچّے تھوڑا ہی ہیں؟ ہنس بول بھی نہیں سکتے۔ کہیں آ جا بھی نہیں سکتے۔ کسی کا ذکر بھی نہیں کر سکتے۔ (ہونٹ بھینچ کر) ایمان سے زندگی تلخ ہو رہی ہے۔

آپا: امّی جان میں تو تبدیلی میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ پہلے اچھی بھلی تھیں۔ جو مرضی کرو جہاں دل چاہے جاؤ۔ مگر اب۔۔۔۔ اب تو خدا جانے کیا بات ہے کہ بات بات پر چِڑ جاتی ہیں۔ ابّا پھر ویسے کے ویسے ہیں۔ تم

لوگوں سے کہنے کی بات تو نہیں مگر کہے دیتی ہوں۔ پرسوں کا ذکر نجمہ یہاں آئی۔ کہنے لگی مدّت کے بعد پرانی سہیلیاں ملی ہیں۔ کسی دن پکنک ہی پر چلیں۔ میں نے امّی سے کہا۔ صاف انکار تو کیا کرتیں، بس ٹال مٹول کر گئیں اور۔۔۔۔۔

(ایک آہٹ)

(سیڑھیوں کے نیچے سے امّی جان کی آواز) بارہ بجنے کو آئے مگر ابھی تک بچّے جاگ رہے ہیں۔ صبح وقت پر نہیں اٹھا جائے گا۔ ہر ایک کو کئی مرتبہ جگانا پڑتا ہے۔

(امّی جان سیڑھیاں چڑھ رہی ہیں)

امّی: خدا جانے اب تک کیا کر رہے ہیں یہ بچّے؟ قصّے کہانیاں ہو رہی ہوں گی ذرا دیکھوں تو سہی۔

نعیم اور ستارہ جو یہ گفتگو بڑے انہماک سے سُن رہے تھے جلدی سے رضائیوں میں دبک جاتے ہیں اور یونہی جھوٹ موٹ خراٹے لینے لگتے ہیں۔ ثریا جلد جلد لکھنا شروع کر دیتی ہے۔ سلیم فوراً ناول تکئے

کے نیچے ٹھونس دیتا ہے اور ایک موٹی سے کتاب کھول لیتا ہے۔ اور آپا۔۔۔۔۔! چپکے سے دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتی ہیں۔

بیزاری

جب امتحان کے دنوں میں مجھے یکلخت تیس چالیس بیماریاں لاحق ہو گئیں۔ دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ جگر نے ہڑتال کر دی اور سو گیا۔ کانوں میں ہوائی جہازوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ٹانسل چپکے چپکے بڑھنے لگے۔ اسی طرح خدا جانے کیا سے کیا ہو گیا تو میں سیدھا سب سے قابل ڈاکٹر کے پاس گیا۔ انہوں نے مجھے بغور ملاحظہ فرمایا اور کچھ دیر سوچ کر بولے۔ تمہارے سب نظام اچھے بھلے ہیں بس تم بیزار ہو۔ میں نے بیزاری کے لیے دوا طلب کی، بولے بیزاری کے لیے دوائیں بے کار ہیں۔

اور واقعی میں بیزار تھا۔ امتحانی بیزاری میں مبتلا تھا۔ اس دن مجھے پتہ چلا کہ خطرناک بیماریوں میں ایک بیماری بیزاری بھی ہے جس کا ذکر طب کی کتابوں میں سرے سے غائب ہے۔ امتحان میں پاس ہوتے ہی یہ بیزاری دور ہو گئی۔

پھر کچھ دنوں کے بعد ایک ڈاکٹر دوست کے ہاں ایک مریض سے میرا سابقہ پڑا۔ اس اللہ کے بندے نے جو شکائتیں بتائیں تو ہم کچھ دیر کے لیے چکرا گئے۔

بولے۔ ”جگر میں گدگدی سی اُٹھتی ہے۔ دِل کروٹ لے کر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ پھر دونوں تلملانے لگتے ہیں اور گردوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ایک زبردست انتشار پیدا ہوتا ہے پھر جیسے بجلی کی تڑپ گردوں سے نکلتی ہے۔ ایک شاخ تو گردن تک آتی اور آنکھیں مٹکنے لگتی ہیں۔ دوسری شاخ تلوؤں تک پہنچتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ چھلانگیں مارتا پھروں۔ پھر حلق میں ایک گیند سی پھنس جاتی ہے اور کانوں میں کتّے بلّیاں شور مچاتے ہیں۔ ناک سے آگ کے شعلے نکلے ہیں اور جذبات کا طوفان لہریں مارتا ہوا خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

میں سوچنے گا کہ غالباً ایسی بیماری آج تک تو دریافت نہیں کی گئی۔ ذرا سی محنت کی تو طب میں ایک نئی بیماری کا اضافہ ہو جائے گا۔ خوشی سے میری باچھیں کھِل گئیں۔ لیکن پھر دل میں شُبہ پیدا ہوا اور خوشی کی لہر چپکے سے اُتر گئی۔

میں نے پوچھا۔ ”صاحب آپ بیزار تو نہیں ہیں؟“

وہ چمک کر بولے ”کیا مطلب؟“

”یعنی آپ دنیا سے بیزار تو نہیں ہیں؟“ میں نے دوبارہ دریافت کیا۔

"افوہ! میں اب سمجھا۔ احقر کا تخلّص مجبور ہے، بیزار نہیں۔ ویسے مطلب ایک ہی ہے دونوں کا۔"

"تو گویا آپ شاعر ہیں؟"

میرے دوست نے ان کا معائنہ کیا اور آخر ان سے کہا گیا۔ "صاحب آپ بالکل تندرست ہیں؟"

بولے "یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ تو گویا ہم یہاں تفریحاً آئے ہیں۔"

آخر تنگ آکر انہیں بتایا کہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں واقعی ٹھیک ہے۔ اُن کا دل گردوں کی جگہ رکھا ہے۔ گردے تلووں میں پڑے ہیں، جگر دماغ تک پہنچا چاہتا ہے۔ اب علاج کا سوال تھا۔ یکایک مجھے کچھ سوجھ گیا۔

پوچھا۔ "کیوں صاحب! آخری غزل آپ نے کب کہی تھی؟"

بولے "دو ڈھائی مہینے ہوئے۔"

پوچھا "اور بیمار کب سے ہیں؟"

ہوئے "بس یہی دو ڈھائی مہینے سے۔"

پوچھا "یہ غزل آپ نے کسی کو سنائی بھی؟"

کہنے لگے ''نہیں تو۔''

کہا''تو آپ ہمیں سُنا دیجئے۔''

بولے ''نہیں صاحب! یہ کیا فرماتے ہیں آپ۔ کہاں یہ ناچیز اور کہاں اس ناچیز کا کلام۔ لیکن خیر آپ مُصِر ہیں تو لیجئے۔''

انہوں نے آدھ گھنٹے تک اپنی غزل گا کر بلکہ رُو کر (کیونکہ اس میں گانا کم اور رونا زیادہ تھا) سنائی۔ ہم نے اچھی طرح داد دی۔ جب وہ غزل سُنا چکے تو ان سے کہا: ''جناب فی الحال تو آپ کے لیے علاج کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر پھر اس قسم کا کوئی دورہ اُٹھے تو تشریف لے آیئے گا۔''

وہ ہنسی خوشی چلے گئے۔ چند مہینوں کے بعد پھر آئے۔ بُرا حال تھا۔ انتہائی بیزاری تھی۔ غزل سنائی اور مسکراتے ہوئے تشریف لے گئے۔

اب کوئی اوسط درجے کا گھرانا لے لیجئے۔ بچّے بیزار ہیں کہ انہیں ڈانٹ دیا جاتا ہے۔ امّی بیزار ہیں کہ نوکر کہا نہیں مانتے۔ نوکر بیزار کہ میاں کے دوست بہت تنگ کرتے ہیں اور میاں بیزار ہیں کہ بچّوں کے ماموں ہر تیسرے روز شکار کھیلنے آجاتے ہیں۔ ماموں بیزار ہیں کہ رائفل کا لائسنس اب تک نہیں ملا۔ چچا اگر

چاہیں تو با آسانی لائسنس مل سکتا ہے۔ چچا بیزار ہیں کہ ان کے صاحبزادے اپنی مرضی کے مطابق شادی کریں گے۔ ان کے صاحبزادے بیزار ہیں کہ جن خاتون کو وہ چاہتے ہیں وہ اب کھنچی کھنچی سی رہتی ہیں۔ اور وہ خاتون بیزار ہیں کہ اب اُن کا ہاضمہ خراب ہوتا جارہا ہے۔ اور اکثر پسلی میں درد ہو جاتا ہے۔

اب پتہ نہیں چلتا کہ یہ بیزاری شروع کہاں اور ختم کہاں ہوتی ہے۔ اور یہ سب کے سب بیزار کیوں ہیں؟ کیا بیزار رہنا ان کا شغل ہے؟ کبھی آپ نے غور کیا اس پر۔۔۔۔۔۔؟

اسی طرح ایک موڈ کی بھی بہت بُری علّت ہے۔ یہ موڈ بیزاری کا چھوٹا بھائی ہے۔ (یہاں صرف بُرے موڈ کا ذکر ہو رہا ہے) جب موڈ شروع ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ آدھ گھنٹے کے اندر بیزاری تشریف لایا چاہتی ہے۔

"سنایئے جناب! آپ کی صحت کیسی ہے؟"

"آج میرا موڈ اچھا نہیں ہے۔"

"افوہ۔۔۔۔۔۔!"

"کل اچھا بھلا تھا۔ آج صبح سے موڈ خراب ہو گیا۔"

"کیوں صاحب سینما چلیئے گا؟"

"نہیں معاف کیجئے میں نے ابھی موڈ کے متعلق عرض کیا تو تھا۔"

یہ موڈ کیا ہوا۔ اچھا خاصا دورہ ہو گیا۔ کہ نہ جانے کس وقت پڑ جائے۔ میں اس قسم کے حضرات سے بہت ڈرتا ہوں جنہیں موڈ کے دورے اکثر پڑتے ہوں۔

مصیبت تو یہ ہے کہ پتا نہیں چلتا کہ یہ موڈ شروع کب ہوا تھا اور جائے گا کب؟ اور اگر چلا گیا ہے تو کب گیا ہے؟ اور پھر کِس وقت ھر آن دبوچے گا؟

نتیجہ نہ نکلتا ہے کہ اس قسم کے حضرات کی باتیں کرتے وقت دل دھڑکتا رہتا ہے۔ دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ خدایا انہیں ابھی بُرا موڈ نہ آئے۔ اگر آئے بھی تو اُس وقت جب ہم چلے جائیں۔

آپ نے کوٹھیوں کے پھاٹک پر نام کی تختیاں دیکھی ہوں گی جن پر لکھا ہوتا ہے کہ "اندر ہیں" یا "باہر گئے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی اگر موڈ کے لیے بھی چھوٹا سا خانہ بنا دیا جائے تو ہماری مشکلیں ایک حد تک آسان ہو جائیں۔

کسی سے ملنے گئے۔ لکھا ہے "اندر ہیں" آگے لکھا ہے "موڈ اچھا ہے" بس ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے بلا دھڑک اندر چلے گئے اور اگر لکھا ہو "اندر ہیں" اور آگے

لکھا ہے "موڈ اچھا نہیں!" یا "موڈ مشکوک سا ہے" (یعنی بالفاظِ دیگر بیزار ہیں) تو فوراًواپس۔

ایک مرتبہ ہمارے دوست کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا۔ ذہن میں یہی بیٹھا ہوا تھا کہ ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب اسے کسی سے محبّت ہو جاتی ہے اور خواہ محبت آگے چلے یا وہیں ختم ہو جائے اس کا اثر ساری عمر زائل نہیں ہوتا۔ چنانچہ وقت کے فرمان کے سامنے مجھے بھی سر جھکانا پڑا اور یہی سمجھ کر یہ پہلی اور آخری محبت ہے اپنابُرا حال کر لیا۔ وہ خاتون مجھ سے ایک سال بڑی تھیں۔ ان کی صحت واجبی سی تھی۔ باتیں تو قنوطیوں کی سی کیا کرتی تھیں۔ ہر وقت بیٹھی سوچتی رہتی تھیں۔ لیکن مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس وقت تو علم نہ تھا لیکن اب وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بیزار تھیں۔

کتنی مرتبہ میں نے کوشش کی کہ ان سے کچھ کہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تکلّف تکلّف میں مَیں اُنہیں کچھ نہ کہوں اور وہ کچھ نہ سمجھیں اور دونوں کا وقت مفت میں ضائع ہوتا رہے۔۔۔۔ لیکن میں کچھ کہہ نہ سکا۔ جب بھی میں ارادہ باندھ کر جاتا تو وہ اس قدر سنجیدہ ہو جاتیں کہ بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی اور مَیں موسم وغیرہ کے متعلق گفتگو کر کے واپس آجاتا۔ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ چند دنوں کے بعد ابا کے ساتھ کہیں باہر جائیں گی۔ ایک ماہر دوست نے بتایا کہ ایسے

موقعوں پر اگر چلتے چلتے اظہارِ محبت کر دیا جائے تو بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ جتنے دن وہ باہر رہیں گی انہیں تمہارا خیال رہے گا اور جب وہ واپس آئیں گی تو ان کے دل میں تم ہی تم ہو گئے۔ چنانچہ میں ان سے ملا۔

بولیں "اررررر۔۔۔۔۔۔ بھئی ذرا پرے بیٹھو۔ یہ اتنی تیز خوشبو کیوں لگائے رکھتے ہو ہر وقت۔۔۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی زکام ہے۔ تعجب ہے تمہیں زکام نہیں ہوتا۔"

"دیکھئے میں ذرا چند باتیں کرنا چاہتا ہوں، بہت ضروری ہیں۔ آپ کہیں باہر جا رہی ہیں نا؟"

"ہاں جا رہی ہوں۔ کوئی اعتراض ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔۔۔ بھلا اعتراض کیا ہو سکتا ہے؟ ویسے آپ سُن لیں گی نا؟"

"سُننے کو سُن لوں گی، کانوں میں انگلیاں تو دینے سے رہی۔ اور یہ کیوں تم لگاتار میری داہنی آنکھ کی طرف دیکھ رہے ہو؟ مانا کہ اوپر کی پلک ذرا سوجی ہوئی ہے۔۔۔۔ مچھر کاٹ گیا تھا۔"

"لاحول ولا۔ میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ آپ کی پلک سوجی ہوئی ہے۔ یہ تو آپ خود۔۔۔!"

’’تو گویا یہ کہنا چاہتے ہو کہ چور کی داڑھی میں تنکا کیوں؟‘‘

’’نہیں تو۔۔۔۔۔لا حول ولا قوۃ۔۔۔۔۔۔بھلا میں۔۔۔۔۔۔!:

’’اور یہ کیا لا حول ولا، لا حول ولا لگا رکھی ہے۔ کوئی شیطان بیٹھا ہے یہاں؟‘‘

میں چپ ہو گیا۔

’’بولتے کیوں نہیں؟ کیا تو باتیں کرنے آئے تھے۔ اور کیا اب گُم سُم بیٹھے ہو۔۔۔
بولو!‘‘

’’اجی کیا خاک بولوں، جی نہیں چاہتا کچھ کہنے کو۔۔۔!‘‘

’’اسی طرح بولتے ہیں بڑوں سے کہیں؟ کیا خاک کہوں۔۔۔۔۔شاباش ہے! پتہ
بھی ہے میں تم سے ایک سال بڑی ہوں۔‘‘

’’جی ہاں! جبھی تو ہمیشہ آپ کا ادب کرتا ہوں، بالکل بزرگوں کی
طرح۔۔۔۔۔!‘‘

’’کیا کہا بزرگوں کی طرح؟ تو تمہارے خیال میں مَیں پچاس ساٹھ برس کی ہوں
اور تم ننھے بچّے ہو۔ بڑوں کی طرح ادب کرتے ہو۔۔۔۔۔ایک سال کا فرق بھی
کوئی فرق ہوتا ہے۔‘‘

(مَیں پھر چپ ہو گیا)

"بولتے کیوں نہیں؟۔۔۔۔ چپ کیوں ہو؟۔۔۔ وہ کوئی سی باتیں ہیں؟" وہ ڈانٹ کر بولیں۔ میں بدستور فرش کو دیکھ رہا تھا۔

"تو گویا اب تم میرے اونچی ایڑی کے جوتوں پر اعتراض کروگے؟ جبھی گھنٹہ بھر سے انہیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہو۔ پھر کہو گے کہ جرابیں کیوں نہیں پہنیں؟"

اتنے میں خادمہ اندر آئی۔

وہ بولیں۔ "فروٹ سالٹ لاؤ۔"

پھر میری طرف دیکھ کر بولیں۔ "پیو گے فروٹ سالٹ؟"

"جی نہیں۔"

"ہاں تم کیوں پینے لگے فروٹ سالٹ؟ جیسے کاٹ ہی تو کھائے گا؟ اب جا کر سب کو بتا دینا کہ میں فروٹ سالٹ پیتی ہوں۔"

"لایئے ایک گلاس پیئے لیتا ہوں۔"

”نہیں بھئی! مجھ پر احسان مت کرو۔ بیشک مت پیو۔۔۔۔ ہاں تو وہ باتیں کیا ہیں جو کہنا چاہتے ہو۔ ذرا جلدی سے بتا دو۔ ابھی دس پندرہ منٹ میں میری ایک سہیلی آنے والی ہیں۔“

میں نے سوچا اتنا قضیہ ہوا ہے چلو اب کہہ ہی دیں۔

میں نے بڑے پُر درد لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ”شاید یہ باتیں میں کبھی نہ کہتا لیکن متواتر بے رُخی نے اور عدم توجہی نے مجھے۔۔۔۔۔!“

”تمہارا گلا کیوں بیٹھا ہوا ہے؟ زکام کا اثر ہے یا نزلے کا؟“

حالانکہ میں نے آواز کو پُر درد بنانے کی کوشش کی تھی۔

”گلا تو ٹھیک ہے!“

”ٹھیک کیسے ہے؟ میں جو کہہ رہی ہوں کہ بیٹھا ہوا ہے۔“

”جی ہاں گلا بیٹھا ہوا ہے بات یہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں گا آپ سُن لیں گی؟۔۔۔“

”ہاں ہاں سُن لوں گی، سُن لوں گی۔ کتنی مرتبہ تو کہا ہے کہو تو عہد نامہ لکھ کر دستخط کر دوں۔۔۔“

”وہ دراصل۔۔۔ ہاں ۔۔۔ میں ان باتوں کا جواب ابھی نہیں چاہتا۔ آپ بے شک ابھی جواب نہ دیں میں۔۔۔“

”چچ چچ۔۔۔۔ بھلا جن باتوں کا جواب تمہیں درکار نہیں اُن کے ذکر سے فائدہ۔۔۔۔؟“

اتنے میں فروٹ سالٹ آ گیا اور ساتھ ہی ان کی سہیلی جس نے بالکل ان خاتون جیسا مُنہ بنار کھا تھا۔

اس کے بعد میں نے کبھی کسی سے اظہارِ محبت نہیں کیا۔ چند سال کے بعد اس راز کا انکشاف ہوا کہ محبت اور بیزاری ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔

اگر بیزاری کی وجہ سوچی جائے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اگر امیری اور غریبی کو لیا جائے تو جواب صفر نکلتا ہے۔ عموماً امیر زیادہ بیزار نکلیں گے۔ غریبوں کو اوّل تو بیزار ہونے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور جو بیزار ہوتے ہیں وہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم تو دنیا میں زبردستی بھیجے گئے ہیں۔ زندگی کا لطف تو امیر اُٹھا رہے ہیں۔ اُدھر امیر ہیں کہ بہت سی دوائیں کھا رہے ہیں۔ اگر بیمار ہیں تو بھی بیزار ہیں۔ اگر بیمار نہیں ہیں تو بھی اسی طرح۔ اگر دُبلے ہیں تو بھی بیزار ہیں اور اگر موٹے ہیں تو

بھی۔ بہت سے امیر گاؤں میں رہنے والے کسانوں پر رشک کھا کھا کر بیزار رہتے ہیں۔ ان سے کوئی کہے کہ بسم اللہ! جاؤ جا کر گاؤں میں رہو منع کون کرتا ہے، لیکن انہیں یہ بھی پتہ ہے کہ اگر گاؤں چلے گئے تو ہفتے بھر میں بیزار ہو جائیں گے۔

کنوارے بیزار ہیں کہ شادی کر لیتے تو اچھے رہتے۔ اور شادی شدہ حضرات الگ بیزار ہیں۔ کہ کیوں کر بیٹھے؟

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بین الاقوامی بیزاری کیوں ہے؟ کہیں یہ تو نہیں کہ یہ خواہشیں ہیں اور اُمنگیں بہانے ہیں اور ہم وقعی بیزار رہنا چاہتے ہیں۔ بیزار رہنا ہماری فطرت میں ہے۔ اور اگر ہم بیزار نہ ہوں تو اداس ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ادب اور خصوصاً ہماری شاعری میں خزینہ پہلو میں اس قدر نمایاں ہے کہ اگر ہم اسے قنوطی ادب کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ ویسے بھی ہماری زندگی میں رنج کو اس قدر دخل ہے کہ جس روز ہم غمگین نہ ہوں اداس ہو جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی آ کر ہمیں غمگین بنا جائے۔ جب ہم ہنستے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گناہ کر رہے ہوں، اور ہمیں ہنسنے کا کوئی حق نہیں خصوصاً زور زور سے ہنسنے کا۔ اسلئے مسکراہٹ کی بڑی سے بڑی لہر منٹوں میں اُتر جاتی ہے۔ ہم پھر

اداس ہو جاتے ہیں اور اپنے رنجیدہ خیالات کے سلسلے کو بڑی حفاظت سے وہیں سے شروع کر دیتے ہیں جہاں قطع ہو گیا تھا۔

ایک چمکیلی صبح کو میرے ایک دوست نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے فوراً ہی شادی نہ کی تو نظامِ شمسی درہم برہم ہو جائے گا اور دنیا ان کی شادی کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی ہے۔ وہ سیدھے میرے پاس آئے مشورہ لینے، میں نے معذرت کی اور بتایا کہ ان معاملوں میں تو میں بالکل اناڑی ہوں۔ جو جی چاہتا ہے۔

بولے نہیں مشورہ ضروری ہے۔ اور وہ بھی تمہارا۔

میں نے کہا۔ "اچھا لیکن جو کچھ کروگے اپنی ذمہ داری پر کروگے۔"

بولے "اس وقت میری نگاہ میں پانچ لڑکیاں ہیں۔ تم سب کو دیکھ چکے ہو۔ برکت، رشیدہ، رفعت، نکہت اور صولت۔"

"دیکھا ہے!" میں نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے خیال میں کون سی بہتر رہے گی؟"

"سب ہی اچھی ہیں۔"

"یوں نہیں، میاں زندگی بھر کا سودا ہے کہیں بعد میں پچھتانا پڑے، ذرا سوچ سمجھ کر مشورہ دینا۔"

"برکت اچھی ہے۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔

"اوّل تو اس کا نام یونہی سا ہے۔ برکت! بھلا کیا بات ہوئی۔ کس چیز کی برکت؟ بڑا غیر شاعرانہ نام ہے، ویسے خاصی ہے۔ لباس پہننے کی بھی تمیز ہے، لیکن ان کے ہاں ایک خاندانی مرض ہے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ سرگوشیوں میں بولے۔ "ان کی تائی جان کا دماغ چل گیا تھا۔"

"یعنی چل پڑا تھا، اور چلتے چلتے کہیں کا کہیں چلا گیا تھا۔"

"نہیں ان کے دماغ میں خلل آ گیا تھا۔ اور ان کے چچا کے چچازاد بھائی بھی کچھ بہکی بہکی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ماموں کی ماموں زاد بہن بھی اِدھر اُدھر کی ہانکتی رہتی ہیں۔"

"اور یہ۔۔۔؟" میں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"ابھی تک تو خیریت ہے۔ لیکن ڈر ہے نہ جانے کب یہ مرض زور کر بیٹھے۔"

"اوہ۔۔۔۔۔۔!خیر رشیدہ سہی۔"

"آخر کس طرح سہی رشیدہ؟ یونہی کہہ دیا۔ دیکھتے نہیں کہ رور بروز دُبلی ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلے سال اس کا وزن خاصا تھا۔ ان سردیوں میں ساڑھے آٹھ پونڈ گھٹ گیا۔ اور اب یہ پورے دوسٹون کم ہو گئی ہے۔"

"امتحان کی وجہ ہو گی۔"

"اجی امتحان کی وجہ نہیں، یوں باقاعدہ دُبلی ہوتی جارہی ہے کہ۔۔۔۔۔۔"

"کہ تمہیں ڈر ہے کہیں دُبلی ہوئی ہوتی غائب نہ ہو جائے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔۔۔۔ لیکن پھر بھی کچھ جی نہیں چاہتا۔"

"تو پھر رفعت سہی۔"

"تم نے کبھی غور سے اس کا چہرہ دیکھا؟ ایک آنکھ چھوٹی ہے اور ایک بڑی۔ شاید دائیں آنکھ چھوٹی ہے۔"

"کبھی ناپ کر دیکھا؟" میں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"مذاق مت کرو۔ اور اس کے علاوہ ہر وقت گم سم بیٹھی رہتی ہیں۔ آج تک اسے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ اس کا چہرہ بھی زرد ہے، ہاں اور اس کے بال بھی چھوٹے ہیں، گرتے بھی ہیں، دماغی کمزوری کی وجہ سے یا نزلے کی وجہ سے۔"

"اور نکہت اس کے بال کتنے لمبے ہیں اور کیسی ہنس مکھ ہے۔"

"لیکن اس کے موٹے ہو جانے کا بڑا ڈر ہے۔ آہستہ آہستہ سُرخ ہوتی جا رہی ہے۔ دو تین سال تک خوب موٹی ہو جائے گی، اور وہ ہے بھی مسخری۔ جب دیکھو ہنستی رہتی ہے۔"

اب فقط ایک خاتون باقی رہ گئی تھیں۔ میں نے سوچا شاید نہیں وہی اچھی لگتی ہوں۔

"تو پھر صولت سے کروگے شادی؟"

"وہ اچھی ضرور ہے اِس میں خوبیاں بھی بہت سی ہیں لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وہ باتونی ہے۔ کیا مجال جو اس کے سامنے کوئی زبان تک ہلا سکے۔ فوراً جرح شروع ہو جاتی ہے۔ بس وکیل ہے۔ بالکل اور میں ٹھہرا امن پسند شخص بحث مباحثے سے بہت گھبراتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

میں دیر تک سوچتا رہا۔ پھر نہایت خلوص سے بولا۔

"میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ ان حالات میں تو تم صبر ہی کر لو۔"

"صبر کر لوں؟ یعنی؟"

"کنوارے رہو۔ دنیا بہت وسیع ہے شاید کسی روز تمہیں۔"

"پھر مذاق پر اتر آئے۔"

"اچھا تو یوں کرو کہ قرعہ اندازی کر لو۔ جس لڑکی کا نام آ جائے اس سے شادی کر لو۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے تمہارے سامنے دل کا راز کہنا تو بالکل۔"

"اچھا ایک مخلصانہ مشورہ دوں؟"

"ہاں ہاں۔"

"تم چھٹی لے کر پہاڑ پر چلے جاؤ۔ وہاں عمدہ غذا کھاؤ۔ خوب ورزش کرو۔ اچھی اچھی کتابیں پڑھو، اور جب صحت درست ہو جائے تو واپس آ کر کسی ایک کا انتخاب کر لو۔"

"تو گویا یہ احترام ہے تمہارے دل میں میرے جذبات کا۔" وہ ناراض ہو کر بولے۔

مَیں نے آخر سچ سچ کہہ دیا۔

"بھیّا نہ قصور کسی لڑکی کا ہے اور نہ تیرا۔ بس تو بیزار ہے، بالکل بیزار۔ اپنی زندگی سے، اپنے آپ سے، دنیا سے، دنیا کی ہر چیز سے بیزار ہے۔"

میں اور ایک صاحب سینما دیکھ رہے تھے۔ دفعتہً وہ میرے کان میں بولے۔

"سبحان اللہ! کیا ناک پائی ہے۔"

"کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ہمارے پیچھے جو صاحب بیٹھے ہیں ان کی۔"

میں نے بڑے آرٹ سے سگریٹ سلگاتے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا۔ مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا۔

"کہاں ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"بالکل ہمارے پیچھے بیٹھا ہے، افوہ! وہ ناک کو رگڑے ڈالتا ہے۔ اب دیکھ بھی چکو۔"

میں نے پھر کروٹ سی لی اور پینترہ بدل کر پیچھے جھانکا۔ (آپ جانتے ہی ہونگے کہ ایسے موقعوں پر کتنی قباحت ہوتی ہے)

"نظر نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

وہ پھر آہستہ سے بولے۔ "مجسم بیزاری ہے بالکل، ایمان سے دیکھنے کی چیز ہے۔ ایسی ناک کے درشن بار بار نہیں ہوتے۔ آخر تمہیں نظر کیوں نہیں آتا؟"

میں نے گردن موڑ کر پھر جھانکا۔

اتنے میں میرے پیچھے بیٹھے ہوئے صاحب روتے لہجے میں بولے۔ "ادھر دیکھئے حضرت! بیزار میں ہوں اور میری ہی وہ ناک وہ نادر شے ہے جس کی تلاش میں آپ ہیں۔ للہ مجھے جلدی سے دیکھ لیجئے اور پھر سیدھے بیٹھ جایئے۔"

میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، ایک بیزار ترین چہرہ عجیب بیزاری سے بیزار تھا۔ جس پر ایک عجیب و غریب ناک چسپا تھی۔

اس کے بعد ان کی ناک اور ترچھی ہوتی گئی۔ اور چہرہ بیزار ہوتا گیا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر ہم بھی بیزار ہوتے گئے۔

ایک مختصر سی بیزاری، ہم موسم کے ہیر پھیر میں خواہ مخواہ مول لیتے ہیں اور بہت سے حضرات موسم پر پیچ و تاب کھا کھا کر بیزار رہتے ہیں۔ کسی گرم دن میں لوگ گرمی کو خوب کوستے ہیں اور کسی برسات کے دن کو یاد کرتے ہیں کہ آہا آہا کیسا ٹھنڈا اور سہانہ دن تھا۔ اور برسات کے دن وہی حضرت بادلوں کو کوس رہے

ہوں گے کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ صبح سے ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ جہاں ہاتھ لگاؤ گیلا ہی گیلا ہے۔ سورج نکلے تو کوئی بات بھی ہو۔

سردیوں میں گرمیوں کا فراق ستاتا ہے۔ گرمیوں میں سردیوں کے قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جس روز بے کار ہوں اس روز کام یاد آتا ہے۔ اور جب کام کر رہے ہوں تو بے کار رہنے کے لیے دل مچلتا ہے کسی بات سے بھی تسلّی نہیں۔

فرمائیں گے۔ ”وہ شام کیسی اچھی تھی۔ ہائے کتنی پیاری تھی وہ شام۔“

پوچھیئے۔ ”کون سی شام اور اس میں کیا تھا؟“

جواب دیں گے۔ ”پچھلے سال جنوری کی ایک سہانی شام، جب ہمیں ایک خوبصورت ترین غروبِ آفتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔“

آج بھی ویسی ہی شام ہے نہایت دلفریب غروبِ آفتاب ہے، اس شام کا ہرگز لطف نہ اٹھایا جائے گا۔ اور کبھی ذکر بھی ہوا تو وہ آج سے دو ایک سال کے بعد ہو گا۔ چونکہ جنوری کی وہ شام گزر چکی ہے۔ اس لیے وہی اچھی تھی۔

کسی محفل میں لطیفے باتیں ہو رہے ہیں۔ مسکراہٹوں سے سب کے چہرے روشن ہیں۔ شگفتگی ہے۔ یکلخت ایک دھند سی چھا جاتی ہے، جو بڑھتی جاتی ہے۔ لوگوں پر ایک نشہ سا چڑھنے لگتا ہے اور دیکھتے دیکھتے مُنہ لٹکنے شروع ہو جاتے ہیں۔ تنے

ہوئے ہونٹ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ ماتھے پر شکنیں آ جاتی ہیں۔ شگفتگی بخارات بن کر اُڑ جاتی ہے۔ پہلے چند آدمی بیزار ہوتے ہیں۔ پھر دیکھا دیکھی اور بیزار ہونے لگتے ہیں اور ذرا سی دیر میں محفل کی محفل بیزار ہو جاتی ہے۔ اس بعض اوقات شبہ ہوتا ہے کہ بیزاری ایک قسم کی چھوت کی بیماری ہے جس کے جراثیم ہوا میں موجود ہیں۔

کوئی بڑا نفیس کرکٹ میچ ہو رہا ہے۔ کھلاڑی بڑی چُستی سے کھیل رہے ہیں۔ لوگ بار بار تالیاں بجاتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔ دفعتہً بولر ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ سلپ کے فیلڈر تو گویا زمین میں دھنس جاتے ہیں اور وقت پر نہیں اُٹھتے۔ باؤنڈری کے فیلڈر اونگھنے لگتے ہیں۔ وکٹ کیپر کوئی عشقیہ غزل دھیمی سروں میں گانے لگتا ہے۔ بیٹسمین قسم کھا لیتے ہیں کہ نہ تو سکور کریں گے اور نہ آوٹ ہوں گے۔ ٹُچ ٹُچ شروع ہو جاتی ہے۔ امپائر اپنی محبوبہ کے خیال میں غرق ہو جاتے ہیں اور کسی اپیل وپیل کو خاطر نہیں لاتے اس وقت فضا میں ایک عجیب "پوستیانپ" (پوست سے نکلا ہے) اثر طاری ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والے بار بار جمائیاں لیتے ہیں اور اونگھنے لگتے ہیں۔ تب یقین ہو جاتا ہے کہ بیزاری کے جراثیم ہوا میں موجود ہیں۔

میں نے بیزار بچّے بھی دیکھے ہیں جو اس قدر جذباتی بن جاتے ہیں کہ اگر آپ کسی کتّے بلّی کو جھڑکیں تو وہ خواہ مخواہ ٹھنکنے لگتے ہیں۔۔۔

یا ان کا چہرہ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے کوئی بُت رکھا ہو۔ انہیں چھیڑو، ہنساؤ، گدگدا، لیکن کیا مجال جو ان پر اثر ہوتا ہو۔ بس یونہی بیٹھے دنیا کی بے ثباتی پر غور کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو شُبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ مراقبے میں تو نہیں۔

ایک مرتبہ میں ایک صاحب سے ملنے گیا، وہ گھر میں نہیں تھے۔ ان کا ایک بچّہ باہر آیا جس کے چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی، پاس آکر چپکا کھڑا ہو گیا۔ نہ علیک نہ سلیک، پوچھا کہ ”بھئی تمہارے ابّا کہاں ہیں؟“

جواب ملا۔ ”باہر ہیں۔“

پوچھا ”کب تک آجائیں گے؟“

بولا۔ ”پتہ نہیں، شاید آنے والے ہوں۔ اور جو نہ آئیں تو رات تک نہ آئیں۔ ویسے آئیں گے ضرور، اکثر آجایا کرتے ہیں۔ آپ بیٹھئے۔“

میں بیٹھ گیا۔ ساتھ کے کمرے سے جھڑکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی خاتون اس بچّے کو دھمکا رہی تھیں کہ ”تو بلکل بدتمیز ہے۔“ بچّہ کہہ رہا تھا ”میں نے کہا تو تھا بیٹھ جایئے۔“ وہ بولیں۔ ”احمق کہیں کے ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ تشریف

رکھیے۔" ذرا سی دیر میں وہ بچّہ مُنہ بنائے آیا اور کواڑ کھول کر بولا۔ "جناب تشریف رکھیے" اور واپس چلا گیا۔

ہمیں صرف عارضی طور پر کبھی کبھی بیزار ہونے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً نزلے یا زکام کے دوران میں۔ یہ بیزاری طبّی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے۔ امتحان کے دنوں میں بھی ہم چند گھنٹے بیزار ہو سکتے ہیں۔

یہ بیزاریاں اس لیے جائز ہیں کہ بالکل عارضی ہیں اور یونہی غائب ہو جاتی ہیں۔

مَیں نے اس مضمون کے شروع میں ایک امتحانی بیزاری بنائی تھی۔ ایک اور سُن لیجئے۔ ہمارا سالانہ متحان تھا۔ پرچے ختم ہو چکے تھے۔ میں انگریز ممتحن کے پاس زبانی امتحان کے لیے گیا۔ ان کے پاس میز پر ایک موٹا تازہ تندرست سا کتّا بیٹھا تھا۔

بولے۔ "یہ کیسا کتّا ہے؟"

میں نے کہا۔ "بہت پیارا ہے۔"

بولے۔ "خوب! تو گویا تمھیں کتّے پسند ہیں۔"

میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں! میں کتّوں پر عاشق ہوں۔"

بولے۔ ”اچھا تو یہ کس نسل کا ہے؟“

مجھے ان کی یہ ادا بالکل نہ بھائی۔ یہ کیا مصیبت لے بیٹھے۔ امتحان کے سوال پوچھیں۔

بولے۔ ”فاکس ٹیریئر ہے کیا؟“

مَیں چپ رہا۔

بولے۔ ”یا بُل ٹیریئر ہے؟“

مَیں چپ رہا۔

بولے۔ ”سپینئل ہے کیا؟“

مَیں چپ رہا۔

کہنے لگے۔ ”کچھ تو بولو۔“

میں نے بیزار ہو کر کہا۔ ”صاحب! یہ بھونکنے والا کتّا ہے۔“

آخری یہ بیزاری چیز کیا ہے؟ اور کیوں چھا جاتی ہے؟ یہ کوئی بیماری ہے؟ یا قلبی کیفیت ہے؟ اس کا تعلق روح سے ہے یا جسم سے؟

یا شاید کچھ بھی نہیں۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔۔۔ عجب سا معمّہ ہے۔ میں نے نہایت دکھیا انسانوں کو مسرور دیکھا ہے۔ ایسے حضرات بھی دیکھے ہیں جن کی زندگی میں صبح سے شام تک ایک بھی خوشی نہیں، لیکن پھر بھی وہ مسکراتے رہتے ہیں اور دوسروں کی ہمت بندھاتے ہیں۔

پتہ نہیں کہ انتہائی بیزاری میں انسان کی حالت کیا ہوتی ہے کیونکہ زیادہ بیزار ہونے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ دل کی روشنی اور روح کی شگفتگی بیزاری کے جانی دشمن ہیں۔ خود ہی سوچئے کہ باہر باغ میں پھول رقص کر رہے ہیں۔ پتّے جھوم رہے ہیں، سبزہ لہلہا رہا ہے، کلیاں شرمائے جاتی ہیں۔ چاروں طرف چمک ہے، مسرّت ہے، زندگی ہے اور ہم ایک گھٹے ہوئے کمرے میں ایک کرسی پر بیزار بیٹھے ہیں۔ اس لیے کہ کسی نے آپ کو کچھ کہہ دیا، کوئی آپ سے بُری طرح پیش آیا، آپ نے کہیں فون کیا اور وہاں آپ کو کوئی نہیں ملا۔ آپ کو ڈر ہے کہ کہیں کوئی آپ سے بے رُخی نہ برتے، یا اگر کوئی وجہ نہیں تو آپ اس لئے بیزار ہیں کہ اگر بیزار نہ ہوں تو اور کریں بھی کیا اور بیزاری آپ کے دن بھر کے پروگرام کا حصّہ ہے۔

عمر خیام کی رباعیات تو آپ نے پڑھی ہوں گی۔ اگر اتفاق نہ ہوا ہو۔ فرصت میں ضرور مطالعہ کیجئے۔ ضروری نہیں کہ عمر خیام کے کہنے کے مطابق ضرور سبزے

پر لوٹا جائے اور نہر کے کنارے بیٹھ کر کچھ پیا جائے اور ہر راہ چلتے سے چھیڑ خانی کی جائے۔ یہ زیادتی ہے لیکن بس مسرور رہنا چاہیے۔ اسی طرح مسرور ادب اور مسرور انسانوں کی صحبت ہماری زندگی میں نئی نئی خوشیاں لے آتی ہے۔

اس چمکیلی سنہری دنیا میں، اس نیلے نیلے آسمان کے نیچے کیا کچھ نہیں؟ مسکراتے ہوئے پھول ہیں۔ ناچتی ہوئی تتلیاں ہیں۔ نسیمِ سحری کے جھونکے، برسات کی جھڑیاں، غروبِ آفتاب کا رنگین شفق۔۔۔۔!سب کچھ تو ہے۔

اور پھر جب کسی ہنس مکھ دوست اور مخلص انسان کی رفاقت میسّر ہو تو پھر بیزار ہونا گناہ ہے۔

ایک نسخہ

ہم یہ چھوٹا سا نسخہ بڑے خلوص دلی سے بتاتے ہیں۔ یہ چند آپ بیتیوں سے اخذ شدہ ہے۔ پہلے پہل ہمارا ارادہ تھا کہ اسے سینہ بسینہ رکھا جائے۔ لیکن اب چونکہ اس کی ضرورت نہیں اس لیے اسے شائع کرانے میں چنداں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ یہ نسخہ یا عمل (جو اب آپ سمجھیں) "تسخیرِ بزرگان" کے لیے ہے۔ یعنی بزرگوں کے مسخّر کرنے کے لئے۔ آپ شاید مُسکرا رہے ہوں لیکن جن حضرات کو بزرگوں پر سحر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اُنہیں ضرور پتہ ہو گا کہ یہ عمل کتنا مشکل ہے۔ بزرگ کسی قسم کے تعویذ گنڈوں اور چلّوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ انہیں عجز و انکسار مسخر کرتا ہے۔ ظاہری شان و شوکت اور اکڑ ان کے لیے چھچھوری چیزیں ہیں۔ شکل و صورت کی وہ ذرا پروا نہیں کرتے۔

ہمیں اس نسخے کا پتہ اس وقت چلا جب ہم ایک بزرگانہ انٹرویو میں بُری طرح فیل ہوئے اور مہینوں تک ہمیں اس قدر احساسِ کمتری رہا کہ ہمارا سر نہ اُٹھ سکا۔

بات یوں تھی کہ ہمارا انٹرویو تھا۔ ایک بزرگ ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔ یہ ہماری ناتجربہ کاری تھی کہ نہ تو ہم نے ان بزرگ کے متعلق کچھ دریافت کیا اور نہ ہی پتہ لگایا کہ انہیں اچھا کیا لگتا تھا اور برا کیا۔ بس ہم اپنے بناؤ سنگار میں لگے رہے۔ جب ہم ان کے سامنے پیش ہوئے تو ہمارا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا اور لب خشک تھے۔

باتیں شروع ہوئیں۔

وہ بولے۔ ”آج کا دن کچھ اداس سا ہے۔“

”جی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آج تو سورج خوب چمک رہا ہے۔ آپ کی کوٹھی کے چاروں طرف جو پھول ہیں وہ خوب مُسکرا رہے ہیں۔ ان پر تتلیاں ناچ رہی ہیں۔ اور آپ کا شوفر بھی قہقہے لگا رہا تھا۔“

”ہوں! خیر! ہو گا! ویسے آج کل سردی بہت جلدی شروع ہو گئی ہے۔ ابھی نومبر کے مہینے سے یہ حال ہے، خدا خیر کرے۔ آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ کہیں نمونیا وغیرہ شروع نہ ہو جائے۔“

”نہیں قبلہ! سردی ابھی کہاں شروع ہوئی ہے؟ کل تو میں تالاب میں تیر رہا تھا۔ اسے ہم خنکی ضرور کہہ سکتے ہیں۔ سردی نہیں۔ اصلی سردی تو کہیں جنوری میں شروع ہو گی۔“

انہوں نے چاء کی ایک چُسکی لگائی اور عینک لگا کر مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے ذرا ٹائی ٹھیک کی اور پینترہ بدلا۔

”تم کچھ بے چین سے ہو رہے ہو برخوردار! کہیں تمہارے پیٹ میں درد تو نہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”پیٹ میں درد!۔۔۔ آج تک بھی میرے پیٹ میں درد نہیں ہوا۔“

”آج تک نہیں ہوا؟“ وہ بڑے تعجب سے بولے۔ ”غضب خدا کا۔“مَیں چاء بنانے لگا۔

”ارے! تم شکر کیوں تھوڑی ڈال رہے ہو؟ کہیں تمہیں ذیابیطس تو نہیں؟“

”ذیابیطس؟ یہ ذیابیطس کیا ہوتا ہے قبلہ؟“

”ایک مرض ہوتا ہے!“ وہ بولے۔

"اچھا تو پھر یہ ہو گا کوئی بڑھاپے کا مرض۔ بھلا اس عمر میں مجھے ذیابیطس وغیرہ کہاں ہو سکتے ہیں۔"

"تو تمہیں سچ مچ پتہ نہیں تھا کہ ذیابیطس کیا ہوتا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ!" انہوں نے پھر چاء کی چُسکی لگائی اور عینک نیچی کر کے مجھے گھورا۔

"اور پیو۔۔۔۔۔۔ برخوردار۔"

"جی نہیں!۔۔۔۔۔۔۔ بس!"

"شاید تمہیں ڈر ہو کہ زیادہ چاء گردوں کے لیے نقصان دہ ہو گی۔ کیوں؟"

"جی نہیں! ویسے میں چاء اس قدر پیتا ہوں کہ کیا عرض کروں۔ پندرہ پندرہ پیالیاں پی جاتا ہوں، لیکن میرے گردے بالکل تندرست و توانا ہیں۔"

"تو تمہارا دِل ضرور دھڑکتا ہو گا۔"

"وہ۔۔۔۔ ذرا معاف کیجئے۔۔۔ دل تو ہر شخص کا دھڑکتا ہے؟"

"نہیں یوں نہیں!۔۔۔۔۔۔ دھما دھم دھما دھم کرتا ہو گا، غشی کے دورے پڑتے ہوں گے، رات کو گھبر اجاتے ہو گے۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ آجاتا ہو گا۔"

"بد قسمتی سے مجھے کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"تو تمہیں آج تک کوئی مرض نہیں ہوا؟"

"جی نہیں!"

"تو گویا تم بالکل تندرست ہو؟" وہ تقریباً چیخ کر بولے۔

"جی ہاں! اور پھر خود ہی خیال فرمایئے۔ میری عمر ہی کیا ہے۔"

۔۔۔۔ یہاں ہمارا انٹرویو ختم ہو گیا۔ اگلے روز پتہ چلا کہ ہم فیل ہو گئے تھے۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ بے انصافی کیوں کی گئی ہمارے ساتھ۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ایک اور دوست سے ملے جن کے ساتھ کسی بزرگ نے بالکل یہی سلوک کیا تھا۔ ہم نے اس معاملے پر بڑا غور کیا۔ راتیں جاگ کر گزار دیں۔ صبح و شام یہی سوچتے رہے۔ آخر ہمیں پتہ چل گیا۔ چنانچہ جب ہمارے تیسرے دوست کو ایک خنک سی صبح کو زکام ہو گیا اور اُنہیں کسی لڑکی سے اس بُری طرح محبّت ہوئی کہ ان کی حالت مخدوش ہو گئی، تب اُنہیں بھی اس قسم کے انٹرویو سے سابقہ پڑا۔ صاحبِ انٹرویو حسبِ معمول ایک بزرگ تھے۔ ہم سب کچھ

سمجھنے لگے تھے، چنانچہ ہم نے ان صاحب کو علیٰحدگی میں یہ نسخہ بتا دیا، انہیں بات یاد کرائی گئی، ریہرسل کئے گئے۔ چنانچہ جب پورا اطمینان ہو گیا تو اُنہیں بزرگ کے سامنے بھیج دیا گیا۔

انہوں نے ہدایات کے بموجب دو روز سے حجامت نہیں کی۔ بھوک ہڑتال بھی کی۔ لباس بھی فضول سا پہن کر گئے۔ جب انٹرویو کے لئے گئے تو چہرہ اور بھی بیزار بنا لیا۔ بزرگ انہیں دیکھ کر مسکرائے اِدھر انہوں نے بُرا سا مُنہ بنا لیا اور بولے۔

"آج دِن کتنا اداس ہے؟"

"واقعی بہت اداس ہے!" بزرگ بولے۔

"صبح سے گرد و غبار کا خول چھایا ہوا ہے، آپ کی کوٹھی کے تمام پھول مرجھائے ہوئے ہیں۔ آپ کا شوفر بھی کچھ بیمار سا نظر آتا تھا۔"

"واقعی!" بزرگ بولے۔ ان کے لہجے میں مسرّت کی جھلک تھی۔

"جی ہاں! اور یہ موسم بھی عجیب مصیبت ہے، ہمیشہ وقت سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ گرمیوں میں گرمیوں سے پہلے ہی گرمیاں شروع ہو جاتی ہیں اور

سردیوں میں بھی یہی ہوتا ہے۔ اب کس قدر گرمی ہے۔ ہر وقت سن سٹروک کا ڈر رہتا ہے۔"

"تمہیں ہوا کبھی سن سٹروک؟" بزرگ بولے۔

"جی ہاں! کئی مرتبہ، پچھلے سال تو تقریباً ہفتہ وار ہوا کرتا تھا۔ اس مرتبہ خدا کا فضل ہے۔"

"خوب! چاء پیو گے؟"

"نہیں قبلہ! میں تو چاء کے پاس بھی نہ پھٹکوں گا، گردوں کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ پچھلے دِنوں مجھے حنذیق الترائب ہو گیا تھا۔ اور اس کے علاوہ طبیع الموقوف اور جمیع الخسارہ بھی دیر تک رہے۔"

"اچھا تو یہ مرض تمہیں چائے پینے سے ہوئے تھے۔"

"جی ہاں! اور مجھے ذیابیطس بھی ہونے لگا تھا۔"

"پھر۔"

"بس بال بال بچ گیا۔ لیکن ہر وقت یہی ڈر رہتا ہے۔" بزرگ کے چہرے پر شفقت کے آثار نمودار ہو گئے۔

شربت منگوایا گیا۔ انہوں نے گلاس ہاتھ میں لیا اور ان کا ہاتھ ہدایت نمبر چھ کے مطابق لرزنے لگا۔ بزرگ نے چونک کر پوچھا۔ ”ارے! یہ ہاتھ کانپ رہا ہے تمہارا؟“

”جی ہاں! جب میں گھبرا جاؤں تو ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں۔“

”تو تمہیں رعشہ ہے گویا۔“

”جی ہاں! رعشہ الاعصابی بھی اور رعشہ الدماغی بھی۔“

”بڑی خوشی ہوئی سُن کر۔“ انہوں نے اپنے کرسی کھینچ کر پاس کر لی۔

”آپ بھی پیجئے نا شربت قبلہ!“

”برخوردار! شربت سے میرے پیٹ میں بائیں طرف درد ہونے لگتا ہے اکثر۔“

”اچھا، صرف بائیں طرف، مجھے تو نہ صرف بائیں طرف ہوتا ہے، بلکہ دہنی طرف بھی اور کمر میں بھی۔۔۔ سب جگہ یکلخت شروع ہو جاتا ہے۔“

”سبحان اللہ۔۔۔ تو کیا سارے پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے۔؟“

”جی ہاں! اور جوڑوں میں بھی۔“

”کیا کہا جوڑوں میں بھی؟“ بزرگ مسرّت سے مغلوب ہو کر بولے۔

”جی ہاں!“

”لیکن تمہاری صحت ماشاء اللہ بہت اچھی ہے۔ تمہیں اتنی بیماریاں ہو کس طرح گئیں۔“

انہوں نے ہدایت نمبر آٹھ پر عمل کرتے ہوئے کہا۔ ”قبلہ یہ بھی کوئی بیماریاں ہیں۔ یہ تو ہر شخص کو ہوتی ہیں اور میں تو بس درشنی پہلوان ہوں۔“

”تم بڑے اچھے لڑکے ہو۔۔۔ لو اور شربت پیو، پیٹ کے درد کا علاج کیا ہے بھلا؟“

”مجھے سب بیماریوں کے علاج زبانی یاد ہیں، کبھی فرصت کے وقت عرض کروں گا۔“

”سچ مچ؟“ وہ اپنی کرسی اور نزدیک لے آئے۔

”پرسوں یعنی پندرہ تاریخ کو چار بجے شام سے مجھے بلڈ پریشر شروع ہو گیا ہے۔“

”مبارک ہو!“ بزرگ چہک کر بولے۔ ”کیا ہوتا ہے یہ؟“

”جی خون کا دباؤ زیادہ ہو جاتا ہے اور خون جسم کے کونے کونے میں ٹکریں مارنے لگتا ہے۔“

”اوہ! خون کا دباؤ۔۔۔ وہ تو میرا ابھی زیادہ ہے۔“ وہ بولے۔

”آپ کا دل دھڑکتا ہو گا۔ جیسے دھما دھم دھڑام دھڑام۔۔۔۔!“

”ہاں! ہاں!!“

”اور آپ رات کو گھبرا جاتے ہوں گے۔۔۔!“

”بالکل۔۔!“

”اور آپ کے سر میں بے تحاشا درد ہوتا ہو گا؟“

”واقعی۔۔۔۔!“

”بس مجھے ہی یہی ہے۔۔۔۔۔!“

”اس کا علاج؟“

”مجھے معلوم ہے، کبھی پھر عرض کروں گا۔ انشاء اللہ۔“

غرضیکہ اس قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ بزرگ کی کرسی نزدیک آتی گئی، حتیٰ کہ دونوں کی کرسیاں آپس میں ٹکرا گئیں۔ اگلے روز نتیجہ نکلا، وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس تھے، فوراً ہی وہ شادی پر اُتر آئے۔ آجکل موٹی موٹی بیماریوں کے آثار، اور علاج انہیں زبانی یاد ہیں۔

ایک بات ہم بھول گئے۔ وہ یہ کہ اگر کسی صاحب کو انٹرویو سے پہلے پتہ چل جائے کہ اس گھرانے کے خاندانی مرض کون کون سے ہیں تو ان سا خوش قسمت کوئی نہ ہو گا۔ فوراً کسی ڈاکٹر سے مل کر ان بیماریوں کے متعلق چھوٹے چھوٹے لیکچر سُن لیے جائیں۔

اور ہاں حجامت اور لباس کے متعلق بھی نہیں بھولنا چاہیے۔

قصّہ چہار درویش

راوی بیان کرتا ہے دو کلمے داستان کے۔ سُنا ہے کسی ملک میں ایک تھانیدار رہتا تھا، جو اپنے تھانے کا بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ اس کے انصاف کا ڈنکا دور دور تک ایسے دائرے میں بج رہا تھا جس کا نصف قطر پچیس میل تھا۔ اُس نے عدل میں نوشیرواں کو پانچ چھ مرتبہ مات کیا تھا۔ ایسا امن ملک کے کسی اور حصّے میں نہیں تھا۔ رعایا سکھ اور چین کی بنسی بجاتی تھی۔ ہر روز چوریاں ہوتی تھیں۔ ڈاکے پڑتے تھے۔ لوگ ایک دوسرے کو مذاق مذاق میں جان سے مار ڈالتے تھے اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ شہر میں کوئی ایسا گھر نہیں تھا جس میں کم از کم دس پندرہ مرتبہ نقب نہ لگی ہو۔ مسافروں کو کوئی چھیڑتا تھا نہ پوچھتا تھا کہ تم کون ہو۔ بس چپکے سے لوٹ لیتے تھے۔ اگر مسافر مدافعت کرتا تو چپکے سے اسے عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف بھیج دیتے۔

تھانیدار خود بڑا نیک دل، دریا دِل بلکہ سمندر دِل انسان تھا۔ وہ اپنی ساری تنخواہ نیک کاموں میں صرف کر دیتا اور اس کا گزارہ اس رقم پر تھا جو لوگ محبت سے

تحفتاً پیش کر دیتے، بعض اوقات وہ ذرا سختی سے کام لیتا اور لوگوں کو مجبور کرتا کہ وہ اسے تحفہ دیں۔ اُس کا رُعب اس قدر تھا کہ بزدل سے بزدل انسان اس کے سامنے کانپنے لگتا۔ اس کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ دولت، حکومت، صحت، عزّت، صنعت و حرفت، جہالت اور شرارت۔ لیکن کسر تھی تو ایک بات کی۔ اس کے ہاں کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے ہاں کوئی لڑکی تھی۔ نہیں! اس کے ہاں کچھ بھی نہیں تھا اور یہی غم تھا جو گھن کی طرح اسے کھائے جا رہا تھا۔

ایک روز آئینہ دیکھتے وقت (وہ آئینہ بہت دیکھتا تھا) اُس نے نوٹ کیا کہ اُس کے سر میں ایک سفید بال چمک رہا ہے۔ وہ دھک سے رہ گیا، اُس کا مُنہ فق ہو گیا۔ اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ جب اُسے اگلے روز ہوش آیا تو وہ سوچنے لگا کہ ایک سفید بال اور وہ بھی سر میں، یا رب العالمین میں نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا جس کی یہ سزا مجھے مل رہی ہے۔ ابھی میں صرف پچاس برس کا تو ہوں ہی، ابھی تو میں جوان ہوں، بھلا اس عمر میں سفید بال۔ واللہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اب تک کوئی لڑکا بھی نہیں ہوا جو گھر بار سنبھالے، جائداد کا وارث ہو اور بڑا ہو کر خاندان کے نام کو بٹّہ لگائے۔

اس نے بڑی دعائیں مانگیں کہ کسی طرح یہ سفید بال سیاہ ہو جائے۔ یا بالکل غائب ہو جائے۔ لیکن دعا قبول نہ ہوئی۔ وہ بے حد غمگین ہو گیا اور ہر وقت افسردہ رہنے لگا۔ اپنی تھانیداری سے غافل ہو گیا اور سارے علاقے میں طوفان سا آ گیا۔ چوری کی وارداتیں کم ہو گئیں۔ مسافر لُٹنے بند ہو گئے۔ نہ لوگوں پر ظلم ہوتے، نہ گھروں میں نقب لگتی۔ غرضیکہ چاروں طرف خاموشی چھا گئی اور رعایا بے چین ہو گئی۔

تھانے کا سارا عملہ تھانیدار کی یہ حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا اور بعض اوقات فرصت میں خون کے آنسو بہاتا۔ آخر تھانیدار کے مصاحبِ خاص یعنی ہیڈ کانسٹیبل سے نہ رہا گیا۔ وہ مردِ دلیر و باصفا ایک روز تخلیہ پا کر بولا۔ اے میرے آقا۔ اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ تھانیدار نے ایک آہ سرد کھینچی جس سے چند پتھر جو وہاں رکھے تھے موم بن گئے اور بولا ”کہو۔“

وہ مردِ نیک بولا۔ ”اے میرے آقا! آپ کا یہ حال دیکھ کر نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام۔ میں تو آپ کا غلام ہوں۔ آپ جب چاہیں میری کھال کی جوتیاں کسی ماہر موچی سے بنوا کر پہن سکتے ہیں یا مجھے کھولتے ہوئے تیل میں ڈلوا دیں۔ میرے خیال میں کھولتا ہوا گھی بہتر ہو گا لیکن یہ ہر وقت کا غم مجھے کھائے جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ آپ کی رعایا کا کیا حال ہے۔ اغیار ہم پر ہنستے ہیں۔

مہینے گزر گئے ہیں کوئی چوری ہوئی ہے نہ کوئی ڈاکہ پڑا ہے۔ مسافر ہیں کہ مزے سے سفر کرتے پھر رہے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں لوٹ رہا۔ اندھیر ہے اندھیرا میرے آقا یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ آپ وجہ بھی تو مفصّل طور پر بیان کیجئے۔ شاید ہمیچمدان اور ناچیز کچھ کر سکے۔"

تھانیدار نے تالی بجائی، دو سپاہی آ گئے۔ تھانیدار بولا۔ "ہمارا گاؤ حقّہ اور فرشی تکیہ لے آؤ۔"

تب کانسٹیبل آنسو ضبط نہ کر سکا اور بولا۔ "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ اس سے پہلے تو سرکار کبھی نہ بہکتے تھے۔ یہ آج کیا ہو گیا، میرے مُنہ میں خاک حضور! آپ نے غلط حکم دیا ہے۔ آپ ان سے فرمایئے کہ یہ فرشی حقّہ اور گاؤ تکیہ لے آئیں۔" دونوں چیزیں آئیں۔ تھانیدار نے حقّہ پینا شروع کیا اور اپنی رام کہانی سنائی۔

تب ہیڈ کانسٹیبل بولا۔ "حضور خدا سے نا امید ہونا کفر ہے۔ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے غم دیا ہے، وہاں اس کا توڑ بھی اتارا ہے۔ بس آج سے آپ خواہ مخواہ خوش رہا کیجئے۔ اس سے آپ کی صحت پر خواہ مخواہ اچھا اثر پڑے گا۔ آپ ہر رات کو دو ہزار نفل پڑھا کیجئے۔ اس سے ثواب بھی ہو گا اور ورزش بھی ہو جائے گی۔ اور آپ علی الصبح قبرستان میں جا کر دعا مانگئے۔ اس سے آپ کا جی بہلے گا۔"

تھانیدار یکلخت مسرور ہو گیا۔ اسے جیسے نئی زندگی مل گئی۔ اُس نے خوب زور و شور سے اپنا کام شروع کر دیا۔ چوریاں، ڈاکے، لوٹ مار، قتل و غارت سب پھر شروع ہو گئے اور رعایا مطمئن ہو گئی۔

وہ ہر روز قبرستان میں جا کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں وہیں بیٹھا رہتا۔ بعض اوقات وہیں سو بھی جاتا۔ نوکر اس کا کھانا وہیں لے آتا۔ ایک روز اسے وہاں ایک سفید ریش بزرگ ملے جن کی داڑھی بالکل سفید تھی۔ انہوں نے اسے بہت ڈانٹا اور چمک کر بولے۔ ''آخر یہاں رکھا کیا ہے جو تو روز ہمیں دق کرنے آ جاتا ہے؟ آخر تو کیوں ہمیں بلاوجہ ڈسٹرب کیا کرتا ہے؟''

تھانیدار دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور بولا۔ ''مجھ پر زمین تنگ ہے اور آسمان کشادہ ہے۔ یہ فقیر خودکشی پر آمادہ ہے۔ صرف ایک اللہ کا سہارا ہے۔ اب جگ میں کون ہمارا ہے۔''

بزرگ سے اس کی آہ وزاری دیکھی نہ گئی انہوں نے کہا ''اللہ رحم کرے گا۔ اچھا تو آج رات فلاں کالج کے ہوسٹل میں جائیو، وہاں تجھے چار درویش ملیں گے جو رات کو آپ بیتیاں سُنا کر دل کی بھڑاس نکالیں گے۔ وہاں تجھے گوہرِ قصور ہاتھ آئے گا۔ کامیابی تیرے قدم چومے گی اور تو شاداں و کامران واپس لوٹے گا۔ کہیں تو ان کے سامنے مت چلا جائیو۔ چھپ کر ان کی باتیں سُنتا رہیو کہیں وہ

تیری شکل دیکھ پائیں اور ڈر کے مارے بھاگ جائیں۔" تھانیدار نے مؤدبانہ سلام کیا اور رات گئے ہوسٹل پہنچا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ بڑی دیوار کے باہر درختوں میں ایک ٹوٹی ہوئی قبر پر دیا جل رہا ہے اور چار پر اسرار شبیہیں بیٹھی ہیں۔ پہلے تو وہ اتنا ڈرا کہ گھگھی بندھ گئی۔ لیکن آخر کار تھانیدار تھا چپکے سے نزدیک گیا۔ دیکھا کہ چار درویش بیٹھے ہیں۔ ہر ایک کے سامنے مٹی کے آبخورے میں بکری کا دودھ اور خشک چھوہارے رکھے ہیں۔ درمیان میں حقّہ رکھا ہے۔ ایک درویش بھنگ گھوٹ رہا ہے اور باقی انتظار کر رہے ہیں۔ بھنگ کو دیکھ کر تھانیدار کا برا حال ہو گیا۔ اس کا بھی چاہا کہ فوراً درویشوں میں شامل ہو جائے لیکن پھر بزرگ کی نصیحت یاد آ گئی اور وہ ضبط کر گیا۔

چاروں درویشوں نے بھنگ کا ایک ایک پیالہ چڑھایا اور حقّہ پینے لگے۔ پھر ان میں سے ایک بولا۔ "بھائیو! یہ پہاڑ سی رات کیونکر کٹے گی۔ کچھ کہو کچھ سُنو۔ انسان انسان کا دارو ہے اور جی بہلاوے کے بغیر زندگی عذاب ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم میں سے ایک باری باری آپ بیتی سُنائے تا کہ ہم سب محفوظ بھی ہوں، عبرت بھی حاصل کریں اور رات بھی مفت میں کٹ جائے۔" سب نے سر ہلایا۔ ہر ایک چاہتا تھا کہ پہلے میں آپ بیتی سناؤں۔ بڑا جھگڑا ہوا، آخر طے ہوا کہ جو درویش بائیں طرف بیٹھا ہے وہ آپ بیتی شروع کرے۔

داستان پہلے درویش کی

پہلے درویش نے آہِ سرد کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر بڑی دردناک آواز میں بولا۔

قصّہ مرا سنو، مرا قصّہ سنو

یا ایک دفعہ یا دو دفعہ یا ہزار بار سنو

سُنتے ہو تو سُنو نہیں سُنتے تو نہ سنو

لیکن مرے خیال میں قصّہ مرا سنو

مجھ غم کے مارے کی داستانِ غم بڑی غمگین اور غمناک ہے۔ ناچیز کا وطن جنوب میں ہے۔ اس لیے رنگ ذرا سیاہ ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا، والدین کو مہربان پایا۔ مال و دولت کی کوئی حد تھی نہ حساب، روپے پیسے میں کھیلا۔ جہاں نثار دوست جو میرے خون کی جگہ اپنا پسینہ بہانے کو تیار تھے، ہر وقت ساتھ رہتے۔ ایسے موافق حالات میں میری تربیت ہوئی کہ میں بہت جلد بڑا ہو گیا۔ میں ساتھ ساتھ فنِ سپہ گری، فنِ معماری، فنِ مزدوری اور فنِ ماہی گیری وغیرہ میں بھی میں طاق ہو گیا۔ جب میں نے پچیس سال کی عمر میں دسویں جماعت پاس کی تو

اس حیرت انگیز کامیابی اور قابلیت کی شہرت دُور دُور پھیل گئی۔ لیکن فلک کج رفتار و ناہنجار و نامعقول کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے کالے کوسوں دور ایک کالج میں بھیج دیا گیا۔ جہاں نہ کوئی رفیق تھا نہ کوئی غمگسار، نہ چارہ ساز، تھا۔ چند روز تو پریشان رہا۔ لیکن روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ طبیعت میں روانی تھی۔ دل میں جولانی تھی۔ ہم نے کچھ ٹھانی تھی۔ چند ہی ہفتوں میں بے شمار دوست بن گئے۔ ان سے مل کر طبیعت تو بہت خوش ہوئی لیکن ایک بات کا غم لگ گیا۔ وہ یہ کہ سب کے سب کسی نہ کسی سے محبت کرتے تھے اور میں ابھی تک اس نعمتِ غیر مترقبہ سے محروم تھا۔ پہلے تو فقیروں اور درویشوں کی طرف رجوع کیا، پھر خود دُعا مانگی کہ محبّت ہو جائے۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔ پھر ایک روز ایک مصوّر کے ہاں چلا گیا۔ وہاں ایک تصویر دیکھی۔ بس آدھا سانس اُوپر اور آدھا نیچے رہ گیا۔ کیا بیان کروں کہ وہ تصویر کیسی تھی اور میں نے کیا دیکھا، یا یوں کہئے کہ اس میں مَیں نے کیا نہیں دیکھا۔

قصّہ مختصر دِل و جان سے اس تصویر پر عاشق ہو گیا۔ آنکھوں میں بے قراری، لبوں پر آہ و زاری اور دل میں بیماری رہنے لگی۔ ایک ماہ کے اندر اندر ہی میرا حال زبوں ہو گیا۔ بالکل پہچانا نہ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو میں اپنے آپ کو بھی نہ پہچان سکتا تھا۔ یہی سمجھتا کہ کوئی اور ہوں۔ یار دوست کترانے لگے۔ وہی دوست جو دانت کاٹے پراٹھے اور دانٹ کاٹے شامی کباب کھاتے تھے، اب

موقع دیکھ کر کنّی کاٹ جاتے ہر روز طرح طرح کے بہانوں سے اس مصوّر کے ہاں جاتا۔ ہر ہفتے اپنی تصویر اُتروا تا اور اس حسین پُر تمکین ماہ جبیں و نازنین کی تصویر دیکھ کر آتشِ شوق بجھاتا۔ ذرا تصویر آنکھوں سے اوجھل ہوئی اور آتشِ شوق دوبارہ بھڑک اُٹھتی۔ مصوّر نے مجھ سے بے رُخی ظاہر کی، پہلے تو میں نے یہ شعر پڑھا۔

هم فقروں سے بے ادائی کیا

آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

لیکن وہ باز نہ آیا۔ چارو ناچار مجبور ہو کر میں پوچھ ہی بیٹھا کہ تصویر کس کی ہے۔ وہ بولا۔ "اے نوجوان! کیا تجھے باؤلے کتّے نے کاٹا ہے، یا تجھے قضا نے پکارا ہے، یا تیرے دن اُلٹے آئے ہیں جو ایسا سوال پوچھتا ہے۔ خبر دار! جو آئندہ اس تصویر کے متعلق کچھ پوچھا ہے تو۔" لیکن عشق کے مارے ہوئے کسی کی پرواہ کرتے ہیں۔ تصویر نے میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میں نے مصور کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہیں بیٹھا ہیا حتٰے کہ وہ دوکان بند کرتا اور گھر کا قصد کرتا۔ میں اس کا تعاقب کرتا اور ساتھ ساتھ اس کے گھر چلا جاتا۔ علی الصبح جب وہ واپس آنے لگتا تو میں بھی ساتھ آتا۔ اسی طرح مدّتیں گزر گئیں۔ آخر اس پتھر کا دل موم ہوا اور اُسے مجھ پر ترس آ گیا۔ وہ آنکھوں میں آنسو لا کر بولا۔ "قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے، وہی

ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ اگر جان بوجھ کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہتے ہو تو بسم اللہ، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ سمجھ لے کہ یہ حسینۂ نازنیں، شمال کے شہنشاہ یعنی حضور خوابیدہ بخت کی بیٹی ہے اور تجھ سے ہزاروں جوان اس کی جوتی کی نوک پر قربان ہیں، یہ کس کی بھی پروا نہیں کرتی۔"

تب میں اس کے قدموں پر گر گیا اور بولا "یا بزرگِ مشفق میری مدد فرمایئے۔" اور دن رات ان کی خدمت کرنے لگا۔ دن گزرتے گئے اور میرا عشق دن دونی اور رات چوگنی ترقّی کرتا گیا۔ آخر ایک روز وہ مجھ پر مہربان ہو کر بولا۔ "ہمیں شروع سے تیرا خیال رہا ہے۔ عرصہ ہوا کہ ہم نے تیری ایک ری ٹچ کیا ہوئی تصویر اس شہزادی کے ہاں بھیج دی ہے اور ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ وہ تجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ اب تو سیدھا کشمیر کا رُخ کر، وہاں سے شمال کی طرف چلا جائیو۔ جب شمال تک پہنچ جائے تو پھر شمال کی طرف چل دیجو۔ وہاں تیری مراد بَر آئے گی لیکن ہمیں نہ بھولنا۔ جو شخص تجھے ملے اس سے ہمارا ذکر ضرور کیجئو، اگر اسے اچھی اور سستی تصویر اتروانی ہو تو سیدھا ہماری دکان کا رُخ کرے۔"

اب بٹوہ جو دیکھتا ہوں تو ایک دمڑی بھی نہ تھی۔ جس کی ٹھرّیاں کھا کر اوپر سے پانی پی لیتا۔ یار دوست پہلے ہی چھوڑ چکے تھے، دشمن بھی ناراض تھے۔ سوچا کہ

چلو بہن کے پاس چلیں۔ لیکن بے چاری سے تو عرصے سے خط و کتابت بند تھی۔ جب اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو سیدھا بہن کے پاس پہنچا۔ وہ ماں جائی مجھے اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بلائیں لیں۔ مسند پر بٹھایا اور آنکھوں میں آنسو لے کر بولی۔ اے بھیا! تیرا یہ کیا حال ہوا۔ میں اصل بات تو بتا نہ سکا۔ بولا مجھے کئی ہفتوں سے بخار آرہا ہے۔ وہ فوراً ایک سنہری کشتی میں دودھ کا پیالہ اور کونین کی دو گولیاں قرینے سے سجا کر لے آئی۔ اور بولی۔ انہیں نوش کر۔ حق تو یہ ہے کہ بہن نے میری بڑی خاطر تواضع کی۔ دن میں چار چار گھنٹے کے بعد دودھ کا ایک پیالہ اور کونین کی دو گولیاں خود بخود مل جاتی تھیں۔ آخر ایک روز وہ بولی۔ ”بھیّا تیری صحت روز بروز گرتی جاہی ہے۔ تو کشمیر چلا جا۔“ اور میرا رواں رواں خوشی سے ناچنے لگا۔ میں نے حامی بھر لی۔ وہ بولی۔ سوداگروں کا ایک قافلہ کشمیر جارہا ہے تو اپنا سامان ان کے سپرد کر کے رسید لے لے اور مزے سے ٹہلتا ٹہاتا کشمیر پہنچ جا۔ میں نے سارا سامان سوداگر کے حوالے کر دیا اور بہن سے رخصت چاہی۔ اس نے تالی بجائی۔ ایک حبشی قلماقنی ایک سنہری پوشاک اور دو کشتیاں اشرفیوں سے بھر کر لے آئی۔ میں نے بڑی حجّت کے بعد یہ سب کچھ لے لیا۔ چلتے وقت بہن نے بلائیں لیں۔ امام ضامن باندھا اور بولی ”جس طرح مُنہ دکھا رہے ہو اسی طرح کسی دن پیٹھ بھی دکھائیو۔ میں چل پڑا۔ راستے میں مصیبتیں آئیں۔ آفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی جگہ مار پٹائی بھی ہوئی لیکن شوقِ دیدار روز

بروز بڑھتا گیا۔ ایک دن میں ایسی جگہ پہنچا جہاں نہ چرند تھے نہ پرند۔ یہاں تک کہ درند بھی غائب تھے۔ جہاں تک نظر جاتی گھاس ہی گھاس دکھائی دیتی تھی۔ بڑا صبر کیا لیکن بھوک سے مجبور ہو کر گھاس کھانا شروع کر دی۔ پہلے پہل تو بدمزہ لگی لیکن پھر عادت ہو گئی۔ شام تک میں گھاس چرتا اور رات کو سو جاتا۔ ایک ہفتے کے بعد مجھ میں تبدیلیاں آنی شروع ہوئیں۔ میں کچھ کچھ گھوڑا بنتا جا رہا تھا۔ میری آواز میں ہنہناہٹ آ رہی تھی۔ میں بے حد چست ہو گیا تھا، بھاگتا خوب تھا اور ایک دفعہ تو میں نے ہوا میں دولتی بھی مار دی تھی۔ میں بہت گھبرایا اور عبادت کرنے لگا۔ بڑے دعاؤں کے بعد میں گھوڑے سے آدمی بنا۔ خیر! تو ایک روز میں منزلِ مقصود پر جا ہی پہنچا۔ ایک جگہ یہ بورڈ آویزاں تھا

"مقصود منزل"

رات کافی گزر چکی تھی۔ شہر کے دروازے بند تھے۔ اِس لئے فصیل کے باہر قیام کیا۔ بستر بچھا کر سونے ہی لگا تھا کہ یکایک ایک آواز آئی۔ جس نے مجھے چونکا دیا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ نزدیک جا کر دیکھتا ہوں تو ایک زخمی کتّا پڑا کراہ رہا ہے۔ مجھے ترس آ گیا اور اسے اٹھا لایا۔ دوسرے روز صبح کو شہر کے دروازے کھلے اور میں اندر داخل ہوا۔ سب سے پہلے میں نے کتّے کو ایک قابل ڈاگ سپیشلسٹ کے حوالے کیا اور خود ایک سرائے میں جا ٹھیرا۔ کئی روز کے علاج اور تیمارداری کے

بعد کتّا تندرست ہوا۔ اس نے غسلِ صحت کیا اور میری جان میں جان آئی۔ میں اسے ساتھ لے کر گلیوں میں پھرا کرتا۔ ایک بزرگ نے مجھے ٹوک دیا۔ بولے "اے نوجوان کچھ جانتا بھی ہے کہ بغیر پٹّے کے کتّا ساتھ لئے پھر رہا ہے؟ اگر کسی نے دیکھ لیا تو تیرا زن بچّہ کولہو میں پلوا دیا جائے گا۔"

میں نے کہا "قبلہ! میرے پاس زن بچہ ہے ہی نہیں۔ میں تو خدا کے فضل سے کنوارا ہوں۔"

بزرگ بولے۔ "اگر زن بچّہ نہیں ہے تو پھر فکر کرنا بے سود ہے۔ تاہم احتیاط لازم ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلنے لگے۔ میں نے روک لیا اور مؤدبانہ بولا۔ "کیا آپ میرے ساتھ قہوہ پئیں گے؟" انہوں نے دعوت منظور فرمائی اور کافی ہاؤس میں بتایا کہ یہ کتّا شہزادی مہ جبیں کا ہے۔

میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ "کیا یہاں سے شمال کی طرف بھی کوئی شہزادی رہتی ہے۔" انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے پوچھا۔۔ "تو پھر آس پاس ہی کوئی شہزادی رہتی ہو۔" وہ جھنجھلا اُٹھے "تم نوجوانوں کو گفتگو کا کوئی اور موضوع نہیں ملتا۔ کیا بھلا تم پالیٹکس کے متعلق کیوں نہیں باتیں کرتے۔ کہہ تو دیا ایک دفعہ کہ اس ملک میں فقط ایک شہزادی ہے اور وہ ہے ماہِ جبیں، یہاں تو کئی کئی سو میل تک کوئی شہزادی نہیں پائی جاتی۔" اور میرا شبہ یقین میں تبدیل

ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی کافر محبوبہ ہے جس نے میرے دل کا خون کیا ہے اور مجھے مجنون کیا ہے، رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ اگلے روز میں کتّا لے کر محل پہنچا، وہاں دربان کے ہاتھ وزیٹنگ کارڈ بھجوایا۔ ایک حبشی غلام ننگی تلوار لے کر آیا اور ایک سرنگ کے رستے مجھے اندر لے گیا۔ وہاں ڈرائنگ روم میں ایک قیمتی مسند پر مجھے بٹھا دیا گیا۔ جس میں بیش قیمت موتی جڑے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک کنیز طرحدار آئی اور بولی۔ ''آپ جنوب سے تو نہیں آ رہے ؟'' میں نے کہا ''ہاں'' تھوڑی دیر کے بعد ایک خواجہ سرا آیا اور بولا۔ ''شہزادی صاحبہ دریافت فرمارہی ہیں کہ کیا آپ وہی جنوب کے شہزادے تو نہیں جنہیں مصوّر عمر عیّار نے بھیجا ہے۔'' میں نے سر ہلا کر کہدیا۔ ''ہاں میں وہی ہوں۔''

اس کے فوراً بعد محفلِ رقص و سرود گرم ہو گئی اور ایک پر تکلّف دعوت شروع ہو گئی۔ ایک ہفتہ تک یہ دعوت رہی۔ لیکن وہ بُت طنّاز نہ آئی۔ بڑے بڑے بہانوں سے میں نے اندر جانا چاہا۔ مگر چند جِن اور دیو جو پہرہ دے رہے تھے انہوں نے مجھے واپس کر دیا۔ آخر میں نے ایک معمّر خاتون سے پوچھا۔ ''شہزادی مہ جبیں کیوں نہیں آتیں؟'' وہ بولیں ''تم ہرگز ہمارے کاموں میں دخل مت دو۔ جس طرح ہو اسی طرح چپ چاپ زندگی کے دن پورے کر دو۔''

میں نے یہی سوال ایک اور خاتون سے کیا۔ ”وہ بولیں خبردار جو یہ بات پھر مُنہ سے نکالی تو، اپنے مُنہ کو سی لو۔ سوئی تاگا میں ابھی بھجوائے دیتی ہوں۔“ میں نے کئی کنیزوں سے یہی سوال پوچھا۔ سب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور بولیں۔۔۔ ”چپ“ ایک نے کہا ”ہشت۔“

تنگ آکر میں نے ایک خواجہ سرا کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ میں شہزادی سے ملنا چاہتا ہوں۔

جواب آیا۔ ”کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“

میں نے کہلوایا۔ ”شربتِ دیدار پینا چاہتا ہوں۔“

جواب آیا۔ ”شربتِ کیوڑہ پی لو۔“

میں نے کہلوایا۔ ”عاشق ناشاد سے ایسی بے رُخی اچھی نہیں۔“

جواب۔ ”چہ خوب، گویا آپ بھی ہمارے عاشق ہیں۔ آپ ہیں کس کھیت کی گاجر۔ آپ نے پہلے ہی مجھے کافی بدنام کر دیا ہے۔ میری امّی آپ سے بے حد خفا ہیں۔“

میں نے ایک شعر لکھ کر بھیجا۔

سچ ہے میں نے ہی تو بدنام کیا ہے تجھ کو

مجھ سے پہلے تری شہرت کبھی ایسی تو نہ تھی

اس کا جواب آیا کہ اوّل تو یہ شعر چرایا ہوا ہے دوسرے ترقّی پسند نہیں ہے۔ آخر میں نے تنگ آکر کہلوایا کہ میں واپس جا رہا ہوں۔

جواب آیا۔ "جایئے مت! میں تو مذاق کر رہی تھی۔" غرض کہ اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ آتشِ عشق نے پھونک ڈالا۔ آتشِ الفت نے بھسم کر ڈالا، شوقِ دیدار نے تڑپا ڈالا۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک روز وہی خواجہ سرا بھاگا آیا اور بولا چلئے حضور! ایک تماشا دکھاؤں۔ میں فوراً اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے حرم سرا میں لے گیا۔ وہاں جو نظارہ دیکھا تو بس آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میرے سامنے ایک ڈکوٹا میں سے ایک نہایت ہی مکروہ صورت اور بد سیرت جن اُترا جس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ خواجہ سرا بولا۔ "حضور آپ چُپ کیوں کھڑے ہیں؟ یہ جن شہزادی کو جان سے مارنے جا رہا ہے۔" میں نے فوراً اُسے للکارا اور مقابلے کی دعوت دی۔ جن فوراً انسانی روپ میں آگیا اور کہنے لگا۔ "کیوں تیری قضا نے تجھے پکارا ہے؟ معلوم ہوتا ہے تو خودکشی کرنا چاہتا ہے۔ اگر تو واقعی لڑنا چاہتا ہے تو یہ جگہ لڑنے کے لیے

ہر گز موافق نہیں ہے۔ نہ یہ وقت لڑنے کا ہے اور نہ میں لڑائی کے موڈ میں ہوں۔ بہتر ہو گا کہ ہم کل یونیورسٹی گراؤنڈ میں لڑیں اور سارا شہر تماشا دیکھے۔"

چنانچہ اسی طرح ہوا۔ سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔ اگلے روز ہمارا مقابلہ ہوا۔ ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے ہم دونوں آمنے سامنے ہوئے۔ سب سے پہلے میں نے اسے دھمکایا۔ اس نے بھی جواب میں دھمکایا۔ میں نے اس کا مُنہ چڑایا، اس نے بھی یہی کیا۔ دفعتاً میں نے پھرتی سے آگے بڑھ کر ایک چپت رسید کیا جس کا جواب گھونسے سے ملا۔ مجھے طیش آ گیا اور میں نے اس زور سے ایک طرف دھکیل دیا۔ اسے بھی غصّہ آ گیا اور بڑے گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ دیکھنے والے دم بخود رہ گئے۔

اس طرح کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ دفعتاً حاکمِ وقت نے جو ریفری کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا سیٹی بجا کر فاؤل دیا اور ہمیں حکم دیا کہ اب اصلی لڑائی شروع کر دیں۔ چنانچہ دونوں نے زرہ بکتر پہنے اور فولاد میں غرق ہو کر ایک دوسرے کا بیڑہ غرق کرنے کو آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔ وہ زرہ بکتر کچھ ایسے تھے کہ انہوں نے ہمیں بالکل چھپا لیا۔ کسی چیز کا بھی پتہ نہ چلتا تھا۔ میں نے گرز لے کر دھا دھم اس کے زرہ بکتر کر کوٹنا شروع کر دیا اور اس نے میرے زرہ کو۔ دیر تک یونہی ہوتا رہا۔ اس کا زرہ بکتر وار کوالٹی کا بنا ہوا تھا چنانچہ مُڑنا شروع ہو گیا۔

ذرا سی دیر میں میرے سامنے ایک مُڑا اتُڑا زرہ بکتر پڑا تھا۔ ایک غلغلہ تحسین و آفرین بلند ہوا۔ میرے آٹو گراف لیے گئے اور اگلے روز اخباروں میں میری تصویریں نکلیں۔ شہزادی سب کچھ سُن چکی تھی۔ جب میں محل میں پہنچا تو وہ دوڑی آئی اور ہم نے پہلی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ خدایا! اس وقت زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا تو بہتر تھا۔ میں نے دیکھا کہ شہزادی مہ جبیں وہ شہزادی نہیں تھی جس پر میں عاشق تھا یا یوں کہ وہ تصویر نہیں تھی جس پر میں عاشق تھا، ادھر شہزادی نے ایک خادمہ کے ہاتھ تصویر منگوائی۔ اسے میری شکل سے ملایا۔ میں وہ شہزادہ نہیں نکلا جس پر شہزادی عاشق تھی۔ ہم دونوں غلط ہستیوں سے محبت کرتے رہے تھے۔ شہزادی اس صدمۂ جانکاہ کی تاب نہ لا سکی اور بیہوش ہو گئی۔ میں مال روڈ پر کسی مستند کیمسٹ کی دکان سے لخلخے کی تلاش میں نکلا تو ایک بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔ میں بے ہوش ہو گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ نہ محل ہے۔ نہ شہزادی بلکہ ایک لق و دق جنگل ہے۔ غالباً چھانگے مانگے کا جنگل اور میرے سامنے ایک مٹی کے آبخورے میں بکری کا دودھ اور پانچ چھوہارے رکھے ہیں۔ میں انہیں کھا کر جلدی سے راستے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مجھے ایک سبز پوش بزرگ ملے جنھوں نے بالکل سبز رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ کہنے لگے کہ تو فلاں شہر کے فلاں کالج میں چلا جا۔ وہاں

ہوسٹل میں تجھے تین درویش ملیں گے جو تیری طرح ناشاد و نامراد ہوں گے۔۔۔۔!

"معاف کیجیے۔" ایک درویش بولا۔ "وہ بزرگ آپ کو گوجرانوالہ کے آس پاس تو نہیں ملے تھے کیا؟"

"جی ہاں بالکل وہیں!!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کیوں؟"

"مجھے بھی وہ وہیں ملے تھے۔ میں اپنا قصّہ بعد میں سناؤں گا۔"

"بس بھائیو میں شکستہ دل ہو کر یہاں چلا آیا اور تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ کہنے کو تو زندہ ہوں۔ لیکن مُردوں سے بدتر ہوں۔ بس زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔"

قصّہ دوسرے درویش کا

دوسرے درویش نے بھنگ کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔

پہلے اُس نے مُس کہا پھر تق کہا پھر بِل کہا

اس طرح ظالم نے مستقبل کے ٹکڑے کر دیئے

"اس ناچیز کا وطن مشرق میں ہے۔ اس لیے چاول اور مچھلی کا خاص شوق ہے۔ میں نہایت ہی بدقسمت، بدنصیب اور بدمذاق ہوں۔ شاید ہی کوئی ایسی آفت ہو جو مجھ پر نازل نہ ہو چکی ہو۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ قدرت جب بھی کوئی نئی مصیبت ایجاد کرتی ہے تو میری رائے ضرور لیتی ہے۔"

میں پیدا ہوا تو والدین کئی سال پہلے للہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ جس دن میں اِس دنیا میں آیا تو سُنتے ہیں اس روز ہمارے شہر میں سارے دن زلزلے آتے رہے۔ ہزاروں مکان گر گئے۔ کئی وبائیں پھیلیں اور آگ بھی لگ گئی۔ جس روز مجھے مدرسے میں داخل کرایا گیا اسی روز ہیڈ ماسٹر صاحب کو باؤلے کتّے نے کاٹ لیا۔ اسی رات سکول میں چوری ہو گئی اور کوئی تمام میزیں اور کرسیاں چرا کر لے گیا۔ جہاں میں جاتا وہیں بدقسمتی میرے ساتھ رہتی تھی۔ جہاں سے گزرتا لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ سب مجھے گھور گھور کر دیکھتے۔ بوڑھے آدمی میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتے کہ یہ لڑکا کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔ اور جب میں گھر پہنچتا تو جتنے پرندے منڈیر پر بیٹھے ہوتے فوراً پٹ پٹ زمین پر گرتے اور سب کا دم نکل جاتا۔

اِدھر دن بڑی سرعت سے گزرتے جا رہے تھے۔ ایک سہانی صبح کو میرے پڑوسی نے مجھے سُنایا کہ اب میں ماشاء للہ جوان ہو گیا ہوں۔ میں نے آئینہ دیکھا

اور اس خبر کی تصدیق کی۔ خوشی سے دل باغ باغ ہو گیا۔ اب مجھے عشق کرنے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ جوان ہوتے ہی سب سے بڑا فرض محبت کرنے کا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں مشق شروع کر دی۔ بات بات پر آہیں بھرنے لگا۔ کئی کئی روز کے بعد حجامت کرتا۔ بال بڑھ گئے۔ گریبان چاک، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، ہاتھوں سے طوطے اُڑ رہے ہیں اور میں خود فاختہ اڑا رہا ہوں۔ اسی طرح سال گزر گیا لیکن دل کی مُراد پوری نہ ہوئی۔ فقیر نامراد ہی رہا۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ کوئی معقول محبوب ہی نہیں ملتا تھا۔ میں نے عشق و محبت کی خونچکاں داستانیں پڑھ پڑھ کر ایک فرضی محبوب کی تصویر بنا رکھی تھی۔ یعنی قد سرو جیسا، گردن صراحی دار اور کئی فِٹ لمبی، ہونٹ سرے سے غائب۔ اور اگر اتفاق سے ہوں تو ان پر خون لگا ہو۔ ناک تلوار کی دھار کی طرح تیز اور ستواں۔ بھنویں کمان کی طرح، آنکھیں ایسی جن سے دھم دھم بجلیاں گریں، شعلے لپکیں، پلکیں ایسی نوکدار کہ نزدیک آؤ تو چبھ ہی جائیں اور خون نکل آئے۔ ایک بہت بڑے امیر کی لڑکی علمِ موسیقی میں ماہر، بہترین شہسوار، شطرنج اور گنجفے میں طاق، نہایت عالی دماغ اور حاضر جواب۔

لیکن میں نے جہاں بھی کوشش کی مایوس رہا۔ جس میں مشکل سے ایک آدھ خوبی ملتی تھی۔ وہاں بقیہ آٹھ دس خوبیاں عنقا تھیں۔ میں نے ہمّت نہ ہاری اور اپنے فرضی محبوب پر بدستور عاشق رہا۔ اتنے میں میرا سالانہ امتحان ہوا اور سارا

عشق یکلخت ختم ہو گیا۔ امتحان کے دنوں میں کچھ ایسی دہشت سوار ہو جاتی ہے کہ کسی چیز کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں تک کہ میں بالکل بھول گیا کہ میں کسی قسم کی شبیہہ پر عاشق تھا۔"

"قطع کلام معاف۔" پہلا درویش بولا۔ "مجھے ایک شعر یاد آ گیا جو میں نے امتحان کے دنوں میں کہا تھا،۔۔۔۔ عرض کیا ہے کہ

عشق کچھ پڑ گیا ہے ٹھنڈا سا

آج کل امتحان ہے پیارے"

سب نے اس شعر کی تعریف کی۔ اتنے میں ایک درویش بولا۔ "اسی وزن پر میں نے بھی ایک شعر کہا تھا اور یہ شعر اپنے محبوب کے ابّا جان کو لکھ کر بھیجا تھا۔ وہ شعر کچھ یوں ہے۔۔

اس کی شادی تو کیوں نہیں کرتا

تیری لڑکی جوان ہے پیارے"

"اور۔۔۔۔۔ میرا دل بے ایمان ہے پیارے۔۔۔۔۔" ایک درویش نے لقمہ دیا۔

بڑا شور مچا، تعریفیں ہوئیں۔ مگر میں نے اپنے محبوب کو یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا۔

تیرے سب خاندان پر عاشق

میرا سب خاندان ہے پیارے"

اس پر ایک اور درویش کہنے لگا۔ "اور میں نے محبوب پر ایک قصیدہ سُنا تھا۔ اس کا ایک شعر یہ تھا۔۔۔

آنکھ تیری ہے آنکھ ناک ہے ناک

اور ترا کان کان ہے پیارے"

پہلے درویش نے چوتھے درویش کی چھوٹی چھوٹی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تیرے عارض پہ اور یہ سبزہ

گویا ٹینس کا لان ہے پیارے

اے دوستو میں نے اپنے محبوب کو بہت تلاش کیا۔ اخباروں میں اشتہار بھی دیے۔ اِس چھان بین نے میرے تحت الشعور کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ میرا لاشعور

تو بالکل ناقص ہو گیا۔ میں بغیر بوڑھا ہوئے سٹھیا گیا۔ طرح طرح کے خیالات میرے دل میں آنے لگے۔

ایک دن رات گئے میں جنگل میں چلا جارہا تھا۔ دفعتاً محسوس ہوا کہ چاند میرا تعاقب کر رہا ہے، میں نے غور سے دیکھا، سچ مچ چاند میری طرف بھاگا آرہا تھا۔

جب چاند قریب آ گیا تو میں نے بھاگنا چاہا۔ چاند نے زور سے کہا ”خبر دار جو ایک قدم اور اٹھایا ہے۔ جہاں کھڑے ہو وہیں کھڑے رہو۔“

”کہئے مزاج تو اچھے ہیں آپ کے، کیونکر آنا ہوا؟“ میں خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔

”چپ چاپ کھڑے رہو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ میں تمہارا کیا لگتا ہوں؟ میرا تمہارا رشتہ کیا ہے؟ یہ انسان بھی عجیب و غریب مخلوق ہے۔ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ لو بس خواہ مخواہ پیچھے پڑ جاتے ہیں۔“ چاند نے دھمکاتے ہوئے کہا۔

”قبلہ! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

"میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ بتاؤ کہ تم مجھے ساری ساری رات کیوں گھورتے رہتے ہو؟ مجھے دیکھ کر طرح طرح کے مُنہ کیوں بناتے ہو؟ اور روتے پیٹتے کیوں ہو؟ آہیں کیوں بھرتے ہو؟"

"کیا تم مجھ سے کسی قسم کی مدد کے طالب ہو؟ بتاؤ"

"وہ بات دراصل یہ ہے۔ دیکھئے میں کسی پر عاشق ہوں۔"

"خوب! میرا ابھی یہی خیال تھا لیکن آخر کیا ہو تم عاشق؟ کسی نے التجا کی تھی؟ ان عاشقوں نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔ رات کو جو میں چپکے سے زمین کی طرف آتا ہوں تو جیسے تمام عاشق میرے منتظر ہوتے ہیں۔ بس ٹکٹکی باندھ کر گھورنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہ چیخ و پکار مچتی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ بھلا کون اِن شریف آدمیوں سے پوچھے کہ جس پر تم عاشق ہو، اس کے سامنے یہ تماشا کرو۔ مجھے خواہ مخواہ کیوں پریشان کرتے ہو؟"

میں معافی مانگنے لگا۔

"تو وعدہ کرو کہ مجھے آئندہ کبھی نہ گھوروگے۔"

میں نے طوعاً و کرہاً وعدہ کر لیا۔

چاند چلا گیا۔ ابھی میں تھوڑی ہی دور گیا ہوں گا کہ مجھے ایک پرندے نے آ لیا۔ دیکھتا ہوں تو بُلبُل تھی۔ اس نے فوراً مجھے گھیر الیا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ مجھے ہمیشہ بدنام کیوں کرتے رہتے ہیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔۔۔۔!"

"آپ نے میرے اور گلاب کے پھول کے متعلق جو جو باتیں اُڑائی ہیں وہ مجھے اچھی طرح معلوم ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیے کہ آپ ایک معصوم ہستی پر تہمتیں لگاتے ہیں، حالانکہ مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔ کوئی واسطہ نہیں۔ میں ان کی کیا پروا کرتی ہوں۔"

"تو پھر تم اُن کا نام کیوں نہیں لیتیں؟"

"میں نے اُن کا نام لیا تو تھا۔" بُلبُل شرما کر بولی۔

"اور اب شرم بھی رہی ہو۔"

"کون شرما رہا ہے۔ اچھا لو میں کہتی ہوں گلاب کا پھول، گلاب کا پھول، گلاب کا پھول، بس! اب تو تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ میں بتائے دیتی ہوں کہ اگر آئندہ تم نے اس سلسلے میں ایک بات بھی کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

بُلبُل تو چلی گئی۔ لیکن اور کئی جانوروں نے مجھے گھیر لیا۔ ہرن نے پہلے تو مجھے دھمکایا۔ پھر دیدے مٹکا کر بولا۔ "اور یہ آپ ہماری آنکھوں کی پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ اگر اچھی ہیں تو ہماری آنکھیں ہیں۔ اس سے آپ کا کیا واسطہ! آپ یہ کیا چشم آہو، چشم آہو، چلاتے رہتے ہیں؟ اور انسانی آنکھ سے میری آنکھ کا مقابلہ کرنا میری سراسر توہین ہے۔ آئندہ آپ خبردار رہیں، ورنہ میرے کھُر خاصے تیز ہیں اور میرے سینگ بھی اُگ رہے ہیں۔"

ہرن ابھی گیا نہیں ہو گا کہ دو سانپ فوراً میرے سامنے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے زُلف والی تشبیہ کے متعلق بحث کی اور یہ ثابت کر دیا کہ میں غلطی پر ہوں۔ مجھے معافی مانگنی پڑی۔ سرو کے درخت نے بھی مجھے ڈانٹا۔ تاروں نے سخت لہجے میں کہا کہ آئندہ ہمیں گِنا تو یاد رکھنا۔ اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ سامنے سے چیتا آرہا ہے۔ سوچا کہ اب یہ اپنی کمر والی تشبیہ کا بدلہ اُتارے گا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ چیتے نے تعاقب کیا۔ میں خاردار جھاڑیوں اور ٹہنیوں سے الجھتا، نالوں اور ندیوں کو عبور کرتا چلا گیا۔ آخر میرا دم پھُول گیا اور میں ڈھیر ہو کر گِر پڑا۔

جب مجھے ہوش آیا تو دیکھتا ہوں کہ نہ کوئی چیتا ہے نہ جنگل۔ ایک لق و دق صحرا ہے جس میں نہ آدم ہے نہ آدم زاد اور نہ آدم بُو۔ کئی ہفتے بھوکا پیاسا پھرتا رہا، پھر ایک سبز پوش بزرگ مِلے جنھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے۔۔۔

"بیٹا زندگی کا چکر ایسا ہی ہے جو کچھ آئے سہنی پڑتی ہے۔ کبھی خدا اچھے دن بھی دکھائے گا۔ تو فلاں کالج جا۔ وہاں تین درویش تیرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انشاءللہ تیرے دل کو قرار آجائے گا۔"

"معاف کیجئے، کیا وہ بزرگ آپ کو گوجرانوالہ کے آس پاس...........!"

"جی ہاں وہ مجھے وہیں ملے تھے۔"

"تعجب ہے۔"

"تو بھائیو یہ ہے میری کہانی اب میں زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔ سارے مشغلے تمام ہو چکے ہیں۔ رات کو چاند کی طرف دیکھنے کی ہمت پڑتی ہے نہ تاروں کو گننے کی۔ عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"یہ کہہ کر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ بقیہ درویشوں نے بمشکل اسے چپ کرایا اور بھنگ کا ایک پیالہ اس کے سامنے رکھ دیا۔"

سیر تیسرے درویش کی

تیسرے درویش نے آسمان کی طرف دیکھ کر زور سے ڈکار لی اور بولا:

نہ کر چارہ کچھ اس سے حاصل نہیں ہے

مِرا دل مرمت کے قابل نہیں ہے

دوستو! میرا قصّہ اِس قدر طویل ہے کہ اگر سنانا شروع کر دوں تو مہینوں گزر جائیں اور قصّہ ختم نہ ہو لیکن میں مختصر نویسی اور کم گوئی کا قائل ہوں۔ میں ترقّی پسند مختصر افسانہ نگار ہوں۔ کوشش کروں گا آپ کو جلد از جلد سب کچھ سمجھا دوں۔ میں بے حد دُبلا پتلا شخص ہوں، اس لیے موٹے آدمیوں سے بہت گبھراتا ہوں، نہ جانے کیوں؟۔۔۔۔۔۔جب میں کسی موٹے آدمی کو دیکھتا ہوں تو مجھ پر غشی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔

"دوستو! میرا وطن مغرب میں ہے اور میں ایک بہت امیر خاندان کی چشم و لالٹین ہوں، اوہ۔۔۔۔ معاف کیجیئے۔ امیر خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔ جوانی تک کوئی ایسہ واقعہ نہیں ہوا جس کا ذکر یہاں کیا جاسکے۔ چالیس سال کی عمر میں شادی طے ہوئی۔ پہلے تو میں نے انکار کیا کیونکہ اس قدر جلد شادی کی کیا ضرورت تھی، پھر سوچا کہ سماج خفا ہو جائے گا۔ بڑی دھوم دھام سے تیّاریاں شروع ہوئیں۔ سِول لسٹ دیکھ کر تمام بڑے بڑے آدمیوں کو مدعو کیا۔ میں نے دُلہن کے لاثانی حُسن کی بڑے تعریفیں سنی تھیں۔ برات وہاں پہنچی۔ اتفاق سے میں نے نکاح سے پہلے دُلہن کو دیکھ لیا۔۔۔۔۔ کیا بتاؤں کہ میرا کیا حال ہوا اس

وقت۔۔۔۔۔بس مت پوچھئے۔۔۔۔۔۔!کسی نے میری آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلاخیں ٹھونس دیں، کسی نے مجھے کوہ سلیمان سے نیچے پھینک دیا۔ کسی نے مجھے خلیج بنگال میں ڈبو دیا جیسے کسی نے میرے سر پر زور سے ڈنڈا مارا۔ اف خدایا! جو کچھ میں نے دیکھا وہ ہرگز بیان نہیں کر سکتا۔ اب تک وہ نقشہ میرے سامنے ہے۔۔۔۔۔میں اسے تاعمر نہیں بھول سکتا۔"

"کیا دیکھا آپ نے۔" ایک درویش بے صبری سے بولا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔ ایسی منحوس گھڑیاں زندگی میں بہت کم آتی ہیں۔ وہ منحوس ترین گھڑی میری زندگی سے اب تک چسپاں ہے، جس قدر میں اسے بھُلانے کی کوشش کرتا ہوں، اتنی ہی وہ یاد آتی ہے۔۔۔۔۔!"

"خدا کے لیے جلد بتایئے آپ نے کیا دیکھا؟"

"اور انسانی فطرت بھی کیسی عجیب ہے کہ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ خیال کو دل سے نہیں بھلایا جا سکتا۔ اور انسانی دل جس پر انسان کو ناز ہے، اس قدر کمزور ہے کہ اس کا کوئی یقین نہیں۔ اب مثال کے طور پر اسی حادثے کو لے لیجئے۔ جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میں اب تک اُسے نہیں بھولا۔ مجھے سب کچھ یاد ہے!"

"آپ کو ہماری قسم، جان کی قسم، آپ کو موٹے آدمیوں کی قسم۔۔۔۔۔۔ ہمیں یوں نہ تڑپایئے۔ جلد بتایئے آپ نے کیا دیکھا۔۔۔" ایک درویش بولا۔

"کیا خاک بتاؤں۔۔۔۔۔۔۔!"

"ہاں ہاں بتائے۔۔۔۔۔ شاباش!"

میں نے دیکھا کہ دلہن کے لباس میں ایک ایسی خاتون بیٹھی ہیں، جن کی صحت ضرورت سے زیادہ اچھی ہے۔ جو بے حد موٹی ہیں۔ اور میں وہاں سے ایسا تابڑ توڑ بھاگا کہ پیچھے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ رستے میں مجھے گوجرانوالہ کے آس پاس وہی سبز پوش بزرگ ملے اور انہوں نے یہاں بھیج دیا۔ بس یہ ہے میری کہانی۔"

چوتھے درویش کی داستان

چوتھے درویش نے زور سے چھینک ماری اور بولا۔۔۔۔۔ "اے دوستو! مجھے اس وقت کوئی موزوں شعر یاد نہیں ورنہ اپنے قصّے کے ساتھ ضرور سُناتا۔ میرا قصّہ دلچسپ بھی ہے اور عبرت انگیز بھی اور نصیحت و فصیحت آموز بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ میرا وطن شمال میں ہے۔ یہ میرے لڑکپن کا ذکر ہے۔ ہماری پڑوس میں ایک نیلم پری رہتی تھی۔ ہر روز اُڑن کھٹولے پر بیٹھ کر عمرو عیّار کی طلسمانی ٹوپی

پہن نگاہوں سے غائب ہو جاتی اور میں دیکھتا رہ جاتا۔ لیکن یہ قصّہ کہیں آپ نے سُنا تو نہیں ہوا۔۔۔۔؟"

"نہیں ہم نے نہیں سنا۔" سب بولے۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟"

"بڑے افسوس کی بات ہے یار۔ تم درویش ہو کر ہمارا یقین نہیں کر رہے۔"

"بھئی معاف کرنا، بات یہ ہے کہ اگر کسی نے کوئی قصّہ پہلے سُن رکھا ہو اور آپ زبردستی مجھ سے دوبارہ سُن لیں تو آپ اسی طرح پشیمان ہوں گے جیسے شہنشا نوشیر وان ایک مکھی کو مار کر پشیمان ہوا تھا۔"

"وہ قصّہ کیا ہے؟ ہمیں سناؤ۔" درویش بولے۔

"کسی ملک میں کوئی بادشاہ حکومت کر رہا تھا اس کا نام تھا نوشیر واں، ایک روز ٹھٹھرتی ہوئی سردی میں وہ بیٹھا ٹھنڈا شربت پی رہا تھا کہ ایک مکّھی اس کی ناک پر جا بیٹھی، اُس نے اڑا دی۔ وہ پھر وہیں آ بیٹھی۔ بادشاہ نے پھر اُڑا دی، وہ کمبخت پھر وہیں آ بیٹھی، بادشاہ کو پہلے ہی سردی لگ رہی تھی۔ اسے غصّہ آ گیا۔ اس نے فوراً سپاہیوں کو حکم دیا کہ مکّھی کو گرفتار کر لیں۔ چنانچہ مکّھی کو گرفتار کر کے حاضر کیا گیا۔ بادشاہ نے قتل کا حکم صادر فرمایا مکّھی نے کہا اے بادشاہ اس وقت تو مجھ سے

وہی سلوک کر رہا ہے جو وزیر اعظم ماشاء للہ صاحب نے ایک پہاڑی بکرے سے کیا تھا۔ بادشاہ نے کہا کہ مجھے وہ قصّہ سُنا۔ معاف کیجئے کیا آپ نے وزیر اعظم اور پہاڑی بکرے کا قصّہ تو نہیں سُنا؟"

"نہیں سُنا۔۔۔۔۔ ہم نے نہیں سُنا۔" سب نے کہا۔

"مکھّی بولی۔ اے شہنشاہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وزیر اعظم ماشاء للہ شکار کھیلنے گئے، وہ چھ ماہ تک جنگلوں کی خاک چھانتے رہے لیکن کچھ نہ ملا۔ آخر ایک روز انہوں نے ایک پہاڑی بکرا دیکھا جو بڑے مزے سے ندی کے کنارے بیٹھا انگور کھا رہا تھا۔ وزیر اعظم بولے۔۔۔ اے بکرے اِدھر آ۔ بکرے نے کمال رعونت سے جواب دیا نہیں آتے۔ غصّے کے مارے وزیر اعظم کا برا حال ہو گیا۔ چلّا کر بولے۔ کیا کہا نہیں آتے؟ بدنصیب بکرے! تجھے معلوم ہے میں کون ہوں؟ بکرا بیٹھا رہا اور مُسکرا کر بولا۔ ہاں معلوم ہے، تم بادشاہ کے مقربِ خاص ہو اور تمہارا نام انشاء للہ ہے۔ انشاء للہ نہیں ماشاء للہ! جاہل، گدھے، بدتمیز تجھے کس نے بکرا بنا دیا؟ تو تو نرا الّو ہے۔ اور اس پر طُرّہ یہ کہ اکیلے اکیلے انگور کھا رہا ہے۔ میں وزیر اعظم ہوں اور ابھی تیری کھال اُتروا سکتا ہوں۔ وزیر اعظم غصّہ سے کانپنے لگے۔ یہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔ بکرے نے کہا۔

وزیر اعظم نے چشمِ زدن میں بکرے کو پکڑ لیا اور تلوار کھینچ کر چاہتے تھے کہ سر تن سے جدا کر دیں۔ اتنے میں بکرا بولا۔ جناب آپ مجھے مار کر اسی طرح پچھتائیں گے جیسے پرنسپل سبز اختر اپنی دخترِ نیک اختر کا رشتہ پروفیسر نادان بیگ سے کر کے پچھتائے تھے۔

وہ قصّہ کیا ہے؟ وزیرِ اعظم نے بے چین ہو کر پوچھا۔ معاف کیجئے، کیا آپ میں سے کسی نے یہ قصّہ سُنا ہے؟"

"نہیں سُنا خدا کی قسم، نہیں سنا۔" درویش چلّا کر بولے۔

"ہاں تو وزیر اعظم کے پوچھنے پر بکرا بولا۔ پرنسپل صاحب بالکل اسی طرح پچھتائے تھے جیسے میاں برخوردار صاحب اسمبلی کے لیے کھڑے ہو کر پچھتائے تھے۔"

"یہ قصّہ کیا ہے؟ وزیر اعظم نے چلا کر پوچھا۔ بکرے نے قصّہ شروع کیا۔ وہ یوں ہے کہ جب میاں برخوردار صاحب اسمبلی کے لیے کھڑے ہوئے تو انہیں ووٹوں کی ضرورت بھی ہوئی۔ وہ گئے ایک زمیندار کے پاس اور کہا کہ مجھے ووٹ دو۔

زمیندار زور سے ہنسا اور بولا کہ تم نے بالکل ویسا سوال کیا ہے جیسا تبّت کے شہزادے نے ایک لومڑی سے کیا تھا۔ میاں برخوردار صاحب بولے وہ کیا تھا؟

زمیندار نے کہا کہ وہ۔۔۔۔۔۔ معاف کیجئے کیا آپ نے یہ قصّہ تو نہیں سنا؟"

"نہیں سُنا بھئی نہیں سنا۔ آخر کس طرح تمہیں یقین دلائیں؟"

"لیکن بھئی مجھے تو پھر شبہ ہو چلا ہے کہ تم نے یہ قصّہ سنا ہے۔"

"ارے بھئی نہیں سُنا، خدا کی قسم نہیں سنا۔ عجیب درویش ہو تم بھی۔"

"تو زمیندار بولا کہ تبّت کے شہزادے نے لومڑی سے پوچھا کہ آج تاریخ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ تو میرے ساتھ بالکل اسی طرح پیش آرہا ہے جس طرح رئیسِ اعظم گنبد رضا ایک مچھلی کے ساتھ پیش آئے تھے۔ یہ قصّہ تو آپ نے ضرور ہی سُنا ہو گا۔۔۔۔۔"

"نہیں سُنا بابا نہیں سُنا، ہم حلف اٹھانے کو تیار ہیں۔ تم یقین کیوں نہیں کرتے؟"

"اور جو تم نے سُن رکھا ہو تو؟"

تھانیدار سے رہا نہیں گیا۔ وہ سامنے آگیا اور چلّا کر بولا "ابے او! صاف صاف بتاتا ہے یا لگادوں ہتھکڑی؟"

اس نے جیبوں پر ہاتھ مارا لیکن وہ ہتھکڑی گھر بھول آیا تھا۔

"ارے! یہ کون ہے؟" درویش چیخ کر بولے۔

"مجھے معاف فرمایئے۔" تھانیدار شرمندہ ہو کر بولا۔ "مجھے غصّہ بہت جلد آجاتا ہے۔"

"مِرا مزاج لڑکپن سے غصیّانہ تھا۔"

"آپ ہیں کون؟"

"میں کون ہوں؟ آہ کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں۔ یہاں کا تھانیدار ہوں۔ بالکل بیکار ہوں۔ مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اور زندگی سے بیزار ہوں۔"

"لیکن یہ بتایئے کہ آخر کس نے آپ کو ستایا ہے، کس نے یہ ستم ڈھایا ہے، اور کس کا خونِ ناحق رنگ لایا ہے۔"

اور تھانیدار نے سارا قصّہ سنادیا۔

قصّہ سنا کر تھانیدار نے شرما کر کہا۔۔۔۔۔ "ذرا سی بھنگ تو عنایت فرمایئے۔" اسے بھنگ دی گئی۔ جسے پی کر وہ بولا۔ "میں نے آپ حضرات کی کہانیاں سنیں، میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔" درویشوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "دراصل ہم خود نہیں جانتے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔"

"میرے خیال میں تو آپ میرے تھانے چلئے وہاں بات چیت کریں گے۔"

"معاف کیجئے قبلہ! یہ تھانے کی دعوت اپنے پاس ہی رکھئے۔" درویش بولے۔ اتنے میں ایک درویش تھانیدار سے مخاطب ہوا۔

"اچھا آپ یہ بتائیے کہ آپ اولاد کیوں چاہتے ہیں!۔۔۔ اور وہ بھی لڑکا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دنیا کی آبادی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور پھر بچّے کچھ ایسی نایاب چیز تو ہیں نہیں۔ گلی کوچوں، سڑکوں، محلّوں میں دیکھئے لاتعداد دکھائی دیں گے۔ اتنے بچّے کہ آپ گنتے گنتے عاجز آجائیں گے۔ سمجھ لیجئے کہ ان کروڑوں بچّوں میں آپ کے بھی چند بچّے شامل ہیں۔" اور تھانیدار دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ واقعی بچّوں کی کوئی ضرورت نہیں، مجھے اب کوئی لڑکا وڑکا نہیں چاہیے۔ اور میں آپ حضرات کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ آپ کنوارے ہی رہیے۔ شادی میں مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں۔ واقعی آج کی

ملاقات ہم سب کے لیے بے حد مبارک ثابت ہوئی۔ خداوند تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

"ارے! چار بج گئے۔" ایک درویش نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"تو پھر کیا ہرج ہے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"ہرج تو کوئی نہیں، بات یہ ہے کہ نو بجے سے ہمارا پرچہ شروع ہو گا اور ہم چاہتے ہیں کہ کچھ دیر سو لیں۔ ویسے ہم پرچوں میں کچھ نہیں لکھا کرتے، لیکن امتحان کے کمرے میں جو تین گھنٹے زبردستی بیٹھنا پڑتا ہے اس کی بڑی مصیبت ہے۔ وہاں لوگ سونے نہیں دیتے۔"

"اچھا تو پھر خدا حافظ، اگر پھر کبھی محفل جمے تو اس خاکسار کو ضرور یاد فرمایئے۔"

"ضرور! ضرور!"

محفل برخاست ہوئی۔ سب کے سب شاداں و فرحان بامراد و کامیاب لوٹے۔ جس طرح خدا نے ان کے دن پھیرے، اسی طرح ہم سب کے بھی دن پھیرے۔ آمین! اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ قصّہ چہار درویش خیریت سے ختم ہوا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

مکان کی تلاش میں

مکان کی تلاش! ایک اچھے اور دل پسند مکان کی تلاش۔۔۔۔۔ دنیا کے اہم اور مشکل ترین امور میں سے ہے۔ بھلا خود ہی سوچئے کہ تلاش کرنے والے کا کیا کیا جی نہیں چاہتا۔ مکان ہلکا پھلکا ہو، حسین ہو، جاذبِ نظر ہو، آس پاس کا ماحول روح پرور اور خوشگوار ہو، سینما بالکل نزدیک ہو، بازار بھی دور نہ ہو۔ غرض بیچ میں مکان ہو تو چاروں طرف شہر کی تمام دلچسپیاں حلقہ بنائے ہوئے ہوں۔ مکان کی تلاش کرنے والی کو آپ سڑک پر جاتے دیکھئے۔ اس کی حلیہ اس کی چال، اس کے چہرے کی ہئیت، اس کی حرکات سب کچھ سب چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوں گے کہ یہ بیچارہ مکان کی تلاش میں ہے۔ مکان تلاش کرنے والے کا حال کچھ کچھ عاشق سے ملتا جلتا ہے۔ آج سے سو دو سو سال پہلے کے عاشقوں سے نہیں بلکہ آج کل کے عاشقوں سے یعنی کوئی چیز معیار پر پوری نہیں اترتی۔ بعض اوقات اچھا خاصہ مکان مل جاتا ہے پھر بھی دل میں بار بار خیال آتا ہے کہ ذرا اور ہاتھ پاؤں مارو شاید اس سے بہتر چیز مل جائے۔

آپ سوچیں گے تو سہی کہ بھلا مکان کی تلاش کرنے میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔ اخبار سے پتہ پڑھا۔ چھٹی کے دن سائیکل سنبھالی اور چل دیئے۔ جہاں ''مکان کرائے کے لیے خالی ہے'' لکھا دیکھا ٹھہر گئے۔ مکان کو اِدھر اُدھر سے سونگھا۔ پانچ چھ منٹ میں پسند کر ڈالا۔ کرایہ طے کیا اور شام تک آ دھمکے۔ مگر نہیں آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔ یہ مشکلات ان پر بخوبی عیاں ہوں گی جنہیں کبھی اس قسم کا تلخ تجربہ ہوا ہو۔ سب سے زیادہ قابلِ رحم وہ لوگ ہیں جن کی قیمتی عمر کا زیادہ حصّہ مکان کی تلاش میں گزرتا ہے اور ان سے دوسرے درجے پر ہیں طلباء حضرات جنہیں اوّل تو مکان اپنی پسند کا نہیں ملتا اور اگر کہیں مل بھی جائے تو پھٹ سے سوال ہوتا ہے۔ ''شادی شدہ ہو یا نہیں؟'' اب آپ ہی بتایئے اس قسم کے نا سمجھ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ایک وقت میں دو کام کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اور جو کسی چالاک سے طالب علم نے کہہ بھی دیا کہ ہاں ہم شادی شدہ ہیں۔ کر لو ہمارا کیا کرو گے؟ تو فرمائش ہوتی ہے کہ ''پہلے بیوی حاضر کرو۔'' جہاں ایک شادی شدہ طالب علم شریف الطبع پرہیز گار، متّقی، خدا سے ڈرنے والا اور شرافت کا پُتلا گردانا جاتا ہے۔ وہاں ایک بد قسمت کنوارے کو آوارہ گرد، بد تمیز، مشکوک چال چلن والا اور خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اکثر معاملہ بالکل اُلٹا ہوا کرتا ہے۔

بات دراصل یوں تھی کہ ہمارے امتحان نزدیک تھے اور ہوسٹل کی فضا کچھ کچھ خراب ہونے لگی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ امتحان صرف ہماری جماعت کے تھے۔ باقی حضرات کے یا تو ہو چکے تھے یا ایک دوماہ کے بعد تھے۔

بڑا ضبط کیا، پڑھنے کے بہتیری کوششیں کی گئیں۔ کمرے کو باہر سے تالا لگوایا جاتا۔ چابی نوکر کے حوالے کر دی جاتی اور اسے خوب تاکید کی جاتی۔ کہ خبر دار جو تونے شام سے پہلے کمرہ کھولا تو۔ مگر ذرا سی دیر میں کامن روم سے پنگ پانگ کی ٹپ ٹپ سنائی دیتی۔ کبھی برج اور شطرنج والوں کا شور دو دو منٹ کے بعد فلک شگاف قہقہے!۔۔۔ ساتھ ہی ریڈیو سے ٹھمریاں اور قوّالیاں پڑوس کے لڑکوں کی نغمہ سرائیاں کوئی ستار بجا رہا ہے، کوئی دِلربا۔ ان سب کا مکسچر دماغ میں گھستا اور سب کچھ ملیا میٹ کر کے رکھ دیتا۔ پڑھا لکھا سب برابر ہو جاتا۔ شام ہوتی تو فٹ بال کی دھما دھم اور ٹینس لان سے گیند کے بلّے پر پڑنے کی پیاری آواز۔ دل میں گدگدی سی ہونے لگتی کہ چلو کھیلیں۔۔۔ لوگ تالاب سے بھیگے بھیگے واپس آ رہے ہیں۔ بہت سے حضرات بن سنور کر سیر کرنے جا رہے ہیں۔ غرض جی بڑے زوروں سے للچاتا۔ دماغ بغاوت کر دیتا کوئی آدھ گھنٹے کے بعد یکلخت جو ہوش آتا تو اپنے آپ کو یا تو کسی سینما ہال میں پاتے یا کسی سڑک پر چہل قدمی کر رہے ہوتے، جو ہوسٹل سے کم از کم دو تین میل دور ہوتی۔ رات بھر اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتے اور قسمیں کھاتے کہ اگر کل پورے بیس گھنٹے لگاتار نہ پڑھا

تو نام بدل لیں گے۔ آخر پاس بھی تو ہونا ہے اور قوّتِ ارادی بھی تو کوئی چیز ہے آخر، مگر دوسرا روز بھی اسی طرح گزر جاتا۔ روز کیا ہفتے یونہی گزر رہے تھے۔ دن بھر کوئی پچاسوں لڑکے ملنے آتے۔

"ہلو!"۔۔۔ اور "اخاہ آیئے" کی دو مختصر چیخیں ماری جاتیں اور پھر وہ حضرات ایسے چمٹتے کہ بس۔

"اررر بھئی! یہ وقت بھی کہیں پڑھنے کا ہے۔ توبہ توبہ! تم لوگ بھی زندگی سے بیزار ہو چکے ہو۔ ایسا بھی کیا کہ آدمی بالکل دھونی مار کر بیٹھ جائے۔ ایمان سے اگر میں اسی طرح دو روز بھی پڑھ لوں تو ایک مہینے کے لیے لیٹ جاؤں۔ جبھی تو مُنہ ذرا سا نکل آیا ہے۔ ذرا آئینہ تو دیکھو! کون سی مصیبت آئی ہوئی ہے، امتحان ہی تو ہے۔ جب دل چاہا پاس کر لیں گے۔ یہ کیا کہ اپنا ستیاناس ہی کر ڈالا۔ ارے میاں! بابر عیش کوش کہ۔۔۔۔۔۔۔۔"

ادھر چہرے پر خواہ مخواہ کی مسکراہٹ ہے اور دِل میں دُعا مانگی جارہی ہیں کہ کسی طرح یہاں سے ٹلے، مگر توبہ کیجیے۔ لیکچر پھر شروع ہوتا ہے۔ "کل ہمارا کرکٹ کا میچ تھا۔ یار تم نہیں تھے، مزا نہیں آیا۔ ویسے ہم لوگ جیت تو پھر بھی گئے وہ جو ہے نا اپنا چھوٹا سا لڑکا! حنیف، ضعیف یا خبیث۔۔۔۔ کیا نام ہے اس کا؟ بھئی بھول گئے تم بھی۔ وہ کل غضب کا کھیلا۔ ان کا ایک بولر تھا۔ خدا جھوٹ نہ

بلوائے کوئی سات فٹ کا ہو گا۔ پورے گینڈے کا گینڈا تھا۔ جب گیند پھینکتا تھا تو زمین ہلتی تھی۔ اور سٹارٹ بھی لیتا ہو گا فرلانگ بھر کا۔ اس کے سامنے اپنا کوئی لڑکا بھی نہیں جما۔ مگر وہی چھوٹا سا لڑکا، میں اس کا نام پھر بھول گیا۔ وہ کچھ قلابازی سی کھا کر یوں بلّا گھماتا تھا کہ پورا چوکا پڑتا تھا۔ ظالم نے وہ شاندار ہٹیں لگائی ہیں کہ بس منٹوں میں ساٹھ سکور کر گیا۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی اچھا کھیلتے! ایک بات مانو تم اتنا آہستہ مت کھیلا کرو۔۔ دیکھنے والوں کو ذرہ بھر مزہ نہیں آتا اور ہاں بھئی! ایک بات دریافت کرنی تھی تم سے امتحان کے بعد تمہارا پروگرام کیا ہے؟ میں پہاڑوں کی نسبت میدانوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ پہاڑوں پر ہوتا ہی کیا ہے بس پہاڑ ہی پہاڑ ہوتے ہیں۔ نہ کوئی نئ چیز نہ تفریح۔ یونہی صبح سے شام تک خانہ بدوشوں کی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرو۔۔۔۔ شام کو آکر سو جاؤ۔ رات کو پہاڑوں پر الّو بولتے ہیں۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ۔"

جی میں آتا ہے کہ کہدیں۔ "او مردود نابکار انسان! تو میدانوں کو چھوڑ کر خواہ انڈیمان چلا جائیو مگر فی الحال تو یہاں سے دفع ہو جا۔" اگر پندرہ بیس منٹ تک یہ صاحب نہ ٹلیں تو پھر نگاہیں کتابوں، کیلنڈر اور دروازے کی طرف دوڑنے لگتی ہیں۔ اور اگر وہ اس پر بھی نہ سمجھیں تو پھر دبی زبان میں امتحان کا ذکر کرنا پڑتا ہے کیونکہ انیس ہی نے تو فرمایا ہے۔

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

وہ اچانک چونک پڑتے ہیں۔ ”ارے بھئی! توبہ توبہ میں بھی کتنا بدحواس ہوں۔ نہ بھول ہی گیا کہ تمہارا امتحان ہے۔ معاف کرنا مجھے۔ سچ مچ پتہ نہیں تھا۔ اچھا امتحان کے بعد سہی!“

چلئے ایک سے تو خلاصی ہوئی۔ ذرا سی دیر میں ایک دوسرے صاحب آجاتے ہیں۔ اور دنیا کی فلم انڈسٹری کے ماضی، حال اور مستقبل پر ایک بسیط لیکچر دیتے ہیں۔ ماسٹر نثار اور مس اندو بالا سے معاملہ رانلڈ کالمین اور بیڈی لیما پر ختم ہوتا ہے۔ فلموں کے بارے میں تنقید ہوتی ہے اور ”جادو کا ڈنڈا“، ”فولادی مُکّہ“ اور ”ظالم گھیسارا“ سے لے کر ”کوئین کرسچینا“ اس ”بن حُر“ تک سب پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ پھر امریکی اور انگلش فلموں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ آخر میں سودیشی فلموں پر فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ پھر تیسرے صاحب آتے ہیں جو عشق کے بارے میں اپنی تازہ ترین تحقیقات مشہور عشاق کی سوانح عمریاں عشق کرنے کے طریقے۔ فوائد اور نقصانات، غرض کہ سب کچھ ہی تو بتا دیتے ہیں۔ پھر ایک اور حضرت آتے ہیں جو دنیا بھر کے پالیٹکس پر ایک جنرل ساریویو کر کے محض دو

گھنٹوں میں دنیا کے بڑے مشاہیر کی سیاسی غلطیاں اور ان کے عیوب سب کچھ سمجھا دیتے ہیں۔

ایک صاحب محض کبڈی ہی کے بارے میں تقریر کیے جائیں گے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ کبڈی بھی کوئی کھیل ہے؟ مگر کبڈی کی تو اریخ بڑے بڑے کھلاڑی۔ کبڈی میں دلچسپی لینے والے بڑے بڑے آدمی۔ راجے مہاراجے غرض کہ سب کچھ بتا کر چھوڑیں گے۔ کوئی صاحب آئیں گے تو مُکّا بازی پر دھواں دھار تقریر کریں گے۔ حالانکہ ان کا حلیہ ایسا ہو گا کہ مُکّا تو کیا اگر ایک ہلکا سا چانٹا بھی مار دیا جائے تو چار پانچ قلابازیاں ضرور کھائیں۔ ادھر خدا مخواہ ہاں میں ہاں ملانی پڑے گی۔ مُسکرا کر اپنی ناقص رائے کا اظہار کرنا پڑے گا۔ سِگرٹوں کے ڈبے خالی ہو جائیں۔ نوکر چائے لاتا لاتا تھک جائے، ہاتھ ملاتے ملاتے انگلیاں دُکھنے لگیں مگر دبی زبان سے ذکر تک نہ کرو۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آبگینوں کو ٹھیس لگ جائے۔ کوئی آتا ہے تو محض تفریحاً گھڑی کو چابی دینے لگتا ہے۔ کوئی صاحب ملتان کی ہلکی پھلکی صراحی کو اس بد تمیزی سے پکڑیں گے کہ ذرا سی دیر میں ایک ہاتھ میں صراحی کی گردن ہو گی اور دوسرے ہاتھ میں بقیہ صراحی۔۔۔ ایک قہقہے پر معاملہ ختم۔

کوئی کتابیں اُلٹ ڈالے گا کہ کہیں کوئی ناول یا غزلوں کی کتاب تو نہیں رکھی۔ کوئی البم ہی دیکھنے لگے گا۔ ذرا نظر چوکی اور ایک آدھ تصویر غائب۔ کوئی صاحب ٹینس کا بلّا اُدھار لے جائیں گے۔ اور تو اور بعض اوقات پتلونیں تک مہینہ مہینہ لوگوں کے ہاں مہمان رہتی ہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ہوسٹل کی زندگی بہترین زندگی ہے۔

بڑے غور و خوض کے بعد فیصلہ ہوا کہ میں اور باقر صاحب دونوں ایک مکان کرائے پر لیں۔ ایک چمکیلی صبح کو ہم دونوں نے چائے پیتے ہوئی پروگرام بنایا۔ کیلنڈر میں دیکھا تو دن سنیچر کا تھا۔ چونکہ سنیچر منحوس سمجھا جاتا ہے اس لئے پروگرام یہ بنا کہ اتوار کو علی الصبح اس مہم پر روانہ ہونا چاہیے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے اخباروں کے مدد سے اور اِدھر اُدھر پوچھ کر خالی مکانوں کی فہرست پہلے ہی بنالی تھی۔ سب سے پہلے ہم ایک ڈیری فارم پہنچے۔ وہاں ایک مکان خالی تھا۔ دروازے پر منشی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس سے مکان کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے جو ڈیری کے فوائد پر لیکچر دینا شروع کیا تو چُپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ دودھ، مکھن، بالائی یہ اور وہ۔۔۔۔۔ غرضیکہ ہر چیز گنوادی۔ شہر میں نقلی چیزیں ملتی ہیں۔ ان سے فلاں فلاں بیماریاں پھیلتی ہیں۔۔۔۔۔۔

ہم تنگ آ کر بولے۔ ”پہلے مکان دکھا دو پھر باتیں کریں گے۔“ خیر اندر گئے۔ دیکھا کہ ایک بڑا کمرہ ہے جس میں اگر فٹ بال نہیں تو کم از کم ٹینس تو ضرور کھیل سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ دو ذرا ذرا سے کمرے جیسے کھلاڑیوں کے لیے بنوائے گئے ہوں کہ ہو سستا لیں یا کپڑے بدل لیں۔ وہ بولا ”اوپر چلئے۔“ ہم نے سوچا کہ شاید اوپر مطلب کے کچھ کمرے ہوں گے۔ دیکھا کہ وہی لمبا چوڑا سا کمرہ اور دو ننھے مُنے کمرے۔ ہم ناامید ہو گئے۔ باقر صاحب بولے ”چلو بھئی چلیں۔ یہ مکان تو ورزش کرنے والوں کے لئے بنوایا گیا ہے۔ بھلا ہمارے کس کام کا۔“ ”نہیں صاحب ابھی ایک منزل اور بھی ہے۔“ امید پھر بندھ گئی۔ اوپر جا کر دیکھتے ہیں کہ بعینہ وہی نقشہ، لا حول ولا قوۃ! جس گدھے نے بنایا حا یہ مکان۔ الٹے پاؤں لوٹے۔ بسم اللہ ہی غلط نکلی۔ دوسرا مکان کوئی آدھ میل کے فاصلے پر تھا۔ دیکھا کہ دروازے پر ایک خطرناک قسم کے مولوی صاحب حقّہ پی رہے ہیں۔ ہمیں نہایت غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھا۔

”مکان چاہیے آپ کو؟“ وہ کڑکے

”جی ہاں!“

انہوں نے تین چار لمبے لمبے کش لگائے اور داڑھی سے کھیلتے ہوئے بولے ”تو گویا سچ مچ آپ کو مکان درکار ہے۔“ جیسے ہم ان سے مذاق کر رہے تھے۔

"تو آپ کو ذرا تکلیف کرنا ہو گی۔ اس مکان کی چابی ہو گی منشی قلندر بخش کے پاس جو رہتے ہیں چنگڑ محلّے میں۔ مگر ٹھہریے خوب یاد آیا۔ اب انہوں نے کباڑی بازار میں رہائش شروع کر دی ہے۔ بڑے بھلے مانس ہیں جناب! کیا کہوں، اگر جوانی میں آپ انہیں دیکھ پاتے تو بس لٹو ہی ہو جاتے۔ یہ عمر ہو گئی مگر ایسا جوان دیکھنے میں نہیں آیا۔ (دونوں ہاتھ پھیلا کر) یہ سینہ تھا۔۔۔۔۔ (اور دونوں کہنیاں نکال کر) چہرہ تھا، بالکل شیر جیسا۔ خدا کی شان اب وہی قلندر بخش ہیں کہ مُنہ پر مکھیاں بھنکتی ہیں۔ پھر بھی کیا مجال جو آن بان میں فرق آ جائے۔"

باقر صاحب بے چین ہو رہے تھے۔ بولے "صاحب اگر برا نہ مانیں تو ذرا چابیاں....!"

"ہاں تو چابیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ چابیاں تو ان کے بھتیجے ایجاد علی کے پاس ہوں گی۔ کیونکہ ان بچاروں کا اپنا تو کوئی لڑکا تھا نہیں۔ بس اپنے مرحوم بھائی کی نشانی کو دیکھ کر دل ٹھنڈا کر لیا کرتے تھے۔ مگر مجھے خطرہ ہے کہ کہیں چابی ان کے بھانجہ قدرت اللہ نہ لے گیا ہو۔ کیوں کہ پرسوں افوہ اُڑی تھی کہ وہ ڈیرہ غازی خان سے واپس آ رہا ہے۔ وہ قلعہ گوجر سنگھ کے پچھم والے حصّہ میں رہتا ہے۔ ایک بڑی سی نالی ہے۔ اس کے پار ایک بجلی کا کھمبا ہے۔ میں اچھی طرح نہیں کہہ سکتا کہ وہ وہاں رہتا ہے یا نہیں۔ بہرحال مکان اس کا وہی ہے"

"مگر ہم اتنی دور نہیں جاسکتے۔"

"آپ چابی کا کریں گے کیا؟ لائیے میں آپ کو نقشہ سمجھائے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر لگے ایک تنکے سے زمین پر نقشہ سمجھانے۔ "ہی غسل خانہ ہے۔۔۔ اور یہ ہے باروچی خانہ۔۔۔۔ ارررر میں اُلٹا کہہ گیا۔ غسل خانہ یہ ہے اور وہ ہے زینہ۔ یہاں ایک کمرہ ہے توبہ توبہ میں بھی کیسا احمق ہوں! یہاں تو ایک چھوٹی سی کوٹھڑی ہے اور زینہ ہے وہاں۔" (مکان کی حد سے باہر بتاتے ہوئے کہا)

"تو گویا زینہ مکان کے باہر پڑوس میں کہیں واقع ہوا ہے؟"

"جی نہیں، میرا مطلب ہے کہ یہ زینہ اندر کی طرف ہے۔"

ہم دونوں اُٹھ کر چل دیے۔

"اجی ٹھہریے۔۔۔۔ ذرا سُنئے تو سہی! ایمان کی قسم اس مرتبہ ٹھیک بتاؤں گا۔ اب سمجھ میں آگیا نقشہ۔" وہ بلاتے ہی رہے۔

اب چلئے مکان نمبر ۳ کی تلاش میں۔ خوش قسمتی سے یہ مکان کالج کے بالکل نزدیک تھا۔ ویسے مکان تھا بھی اچھا خاصا۔ ہمیں دور ہی سے پسند آگیا۔ معلوم ہوا

کہ مکان کے دو حصّے ہیں۔ ایک میں مالک مکان رہتے ہیں اور دوسرا خالی ہے۔ وہ صاحب عجیب اینچی سے تھے۔ باقر صاحب آہستہ سے بولے۔

"بھئی مجھے نہ شخص بالکل پسند نہیں۔ اس کی حرکات عجیب سی ہیں۔"

ہم نے کہا۔ "السلامُ علیکم۔"

بولے۔۔۔ "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکتہ" (ایک ایک لفظ میں نون غنہ بسا ہوا تھا۔ بعد میں جو گفتگو ہوئی اس میں بھی نون غنہ بدستور رہا)

"کیسے تشریف آواری ہوئی جناب؟"

"آپ کا مکان۔۔۔۔۔۔!" باقر صاحب بولے

"اجی! بس کا نام، خدا تمہارا بھلا کرے، سمجھو کہ بڑے خوش نصیب ہو جبھی تو کھٹ سے ایسا مکان مل گیا ورنہ کیا نام۔۔۔۔۔ میں نے کہا جناب بڑے بڑے آدمی مہینوں حیران و پریشان گلی کوچوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جناب مکان نہیں ملتا۔ اور پھر یہ محلّہ بس خدا تمھیں خوش رکھے، سب محلّوں کا سرتاج ہے۔ دیوان صاحب کا کٹڑہ!"

"کیا فرمایا آپ نے، دیوان جی کا کیا؟"

"جناب کیا نام کہ سب محلّوں کا سر تاج ہے۔ دیوان صاحب کا کٹڑہ، اب اس کٹڑہ پر کیا نام کہ ایک لطیفہ یاد آگیا۔ ایک تھے میں نے کہا مولوی صاحب۔ وہ آئے دلی میں کپڑا خریدنے۔ اب اب خدا تمہیں خوش رکھے! ہو گا کوئی شادی وادی کا معاملہ۔ اب قصّہ اسی طرح چلتا ہے کہ انہوں نے کپڑا خریدا۔ کیا نام نیل کے کٹڑے سے اور واپس چلے گئے۔ اب صاحب کوئی دس سال کے بعد میں نے کہا انہیں پھر ضرورت ہوئی کپڑے کی۔ وہ پھر دلی آئے اور ایک تانگے والے سے کیا نام بولے۔۔۔ ہمیں نیل کے بھینسے لے چل۔ اب صاحب خدا تمہارا بھلا کرے یوں تو دلی میں ہزاروں بازار اور لاکھوں گلیاں ہیں اور یوں بھی کیا نام تانگے والے ہوتے ہیں بڑے ظالم۔ پر صاحب تانگے والے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا بولا۔۔۔ بڑے میاں یہ عمر ہو گئی اور ہنسی مزاق کی عادت نہ گئی۔ اب تک بھلا نیل کا بھینسا بھی دلی میں کسی نے سنا ہے۔ اب کیا نام بڑے میاں بھی چٹاخ سے بولے۔ ابے میں نے کہا کل کے لونڈے چلاتا ہے ہمیں! ابھی دو سال گزرے ہم نے نیل کے کٹڑے سے کپڑا خریدا تھا اور اب خدا تمہارا بھلا کرے دس سال میں وہ کمبخت کٹڑا بھینسا بھی نہ بن گیا ہو گا۔ اب صاحب جو مذاق۔۔۔۔۔۔"

"جناب اس مکان کا کرایہ۔"

"ارے صاحب! کیانام اتنی جلدی کا ہے کی ہے۔ جو مرضی آئے دے دینا خدا تمہیں خوش رکھے۔ آپ کے آنے سے ذری رونق ہو جائے گی۔ ذری میں نے کہا محفلیں گرم ہوا کریں گی۔ یہاں سارنگی اور طبلوں پر مہینوں گرد جمی رہتی ہے۔ آپ دونوں کیانام ماشاء للہ رنگیلے دکھائی دیتے ہیں۔ بس جناب مزا آجائے گا۔ اور خدا تمہارا بھلا کرے جب تک کوئی سننے والا نہ ہو کیانام گانے بجانے کا مزا ہی کیا۔"

اب جو ہم وہاں سے بھاگے ہیں تو کوئی آدھ میل آکر دم لیا۔۔۔لا حول ولا قوۃ! گانے بجانے کی محفلیں۔۔۔بس سمجھ لیجئے رونگٹے کھڑے ہو گئے جس چیز سے ڈر کر ہوسٹل سے بھاگے تھے، وہی سامنے آموجود ہوئی۔

واپس ہوسٹل آئے۔ باقر صاحب نے الماری سے اشتہار نکالا۔ لکھا تھا۔۔۔ "ایک مکان بجلی اور پانی سے آراستہ و پیراستہ۔ باورچی خانے اور غسل خانے سے مزیّن، صاف ستھرا اور پاکیزہ عقب خاندانی دواخانہ حویلی سیٹھ رام نرائن مرحوم و مغفور باشندہ دلی۔۔۔ کباڑی بازار۔"

"ارے پھر وہی کباڑی بازار؟"

مکان دیکھا۔ مکان کچھ ایسا تھا جیسے امریکہ میں ہوتے ہیں۔ یعنی بے تحاشا اونچا۔ نیچے پونے دو کمرے یا ڈیڑھ ہی سمجھئے یعنی ایک اوسط کمرہ، دوسرا اس سے نصف اور تیسرا اس کا نصف۔ پھر سیڑھیاں شروع ہوئیں۔ جیسے قطب صاحب کی لاٹھ پر چڑھ رہے ہوں۔ چڑھتے گئے اوپر جا کر ڈھائی کمرے ملے مگر دراصل حساب کے مطابق وہاں صرف سوا کمرہ ہی تھا۔ یعنی نچلے کمروں سے وہ نصف تھے۔

ہماری رہنما بولے۔ ”یہ غسل خانہ ہے۔“

”اور نیچے؟“ میں نے پوچھا ”وہ کیا تھا؟“

”جناب وہ باورچی خانہ تھا؟“

”اور ساتھ یہ دو چھوٹے چھوٹے کمرے؟“

”ایک سامان رکھنے کا گودام اور دوسرا سونے کا کمرہ۔“

”انتہائی بدمذاقی ہے۔“ میں نے جھلّا کر کہا۔

”اجی ابھی اوپر اور کچھ بھی ہے۔“

”نہیں صاحب بس۔“

”اجی آپ کو ہماری قسم، ذرا ملاحظہ تو فرمائیے۔“ وہ صاحب بولے۔

پھر وہی بے شمار سیڑھیاں چڑھنی پڑیں۔ للہ للہ کر کے اُوپر پہنچے۔ دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ سانس پھولا ہوتا تھا۔ اوپر جا کر دیکھتے ہیں کہ ایک چھوٹی سی کوٹھری ہے، ایک مرغیوں کا ڈربہ ہے۔ ایک طرف کبوتروں کی چھتری ہے اور ایک کونے میں پرانا ڈھول پڑا ہے۔ ہمیں ہنسی آگئی۔ بھلا کوئی اس مسخرے سے پوچھتا ہے کہ چھت پر کبوتر تو بے شک رکھے جاسکتے ہیں مگر مرغیاں کون گدھا رکھتا ہوگا اور پھر وہ ڈھول؟۔۔۔ سارے مکان کا نقشہ ہی فضول سا تھا جیسے کسی افیمچی نے مکان بنایا ہو۔ جب ذرا پینک دور ہوئی۔ ایک آدھ کمرہ بنوا دیا۔ کوئی کہیں سے، کوئی کہیں۔

"اب اُترنا بھی پڑے گا۔" ہم نے دل میں سوچا۔

نیچے اتر کر فہرست نکالی۔ نیا مکان دیکھا۔۔۔ دیکھتے ہیں کھلی ہوئی جگہ میں ایک خوبصورت سا مکان چمک رہا ہے۔ میں نے باقر صاحب سے ہاتھ ملایا۔ آخر ہم نے منزل مار لی تھی۔ اب جو دروازے پر دیکھتے ہیں لکھا تھا۔ "حسرت کدہ" طبیعت پر اوس سی پڑ گئی۔

"اس کا مطلب؟" باقر صاحب حیران ہو کر بولے۔

"جناب یہ کسی شاعر کا مکان معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

شاعر صاحب بلائے گئے تو معلوم ہوا وہ نچلے حصّہ میں رہتے ہیں۔ اوپر کا حصّہ خالی تھا۔ شاعر صاحب بھی بس ایسے کہ ڈبیا میں بند کر کے رکھنے کے قابل۔ دبلے پتلے، شتر مرغ جیسے ناک پر عینک چسپاں، حلیہ ایسا کہ اگر سڑک پر جاتے ہوں تو بچّہ تک بتا دے کہ وہ جا رہا ہے شاعر۔ چل کس طرف رہے ہیں۔ مُنہ کہیں ہے اور قدم کہیں پڑتے ہیں۔

باتیں شروع ہوئیں۔ انتہائی لطیف باتیں، بات بات میں شاعری فرمانے لگے۔ ”جب رات کو ساری کائنات پر ایک عجیب سا نور طاری ہوتا ہے، جب بے قرار دل بے طرح تڑپ رہا ہوتا ہے، جب فضا بھی بھیگی بھیگی سی ہوتی ہے، جب آسمان میں تارے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں تو جو لطف اوپر کے مکان میں آتا ہے وہ نیچے کے مکان میں کہاں۔ آہ اگر میرا بس چلے تو دنیا کے تمام مکان اوپر کے مکان بنا دوں۔“ (یہ فقرہ ہماری سمجھ میں نہ آیا) ہم عجیب کشمکش میں پھنس گئے۔ ایک طرف تو ایسا خوبصورت مکان اور دوسری طرف یہ شاعر۔۔۔!

وہ یکلخت چمک کر بولے ”صاحب آپ مجھے رومان پسند لگتے ہیں!“

”کیا میں؟“ میں نے تعجّب سے پوچھا۔ ”یا یہ؟“

"جی ہاں! آپ! آپ کا حلیہ، آپ کے کپڑے، آپ کی حجامت اور آپ کے کپڑوں کی خوشبو سب کے سب گواہی دے رہے ہیں۔۔۔ گواہی کیا چغلی کھا رہے ہیں۔"

میں اپنے اس نئے خطاب پر حیران تھا۔

شاعر صاحب فرمانے لگے۔ جناب بندہ فطرتاً رومان پرست ہے بلکہ حُسن پرست، چنانچہ میری شادی۔۔۔۔ آؤ میری شادی۔۔۔۔ یہ ایک لمبی داستان ہے جو کبھی آپ کو فرصت میں سناؤں گا۔ ایک خونچکاں داستانِ حسن و عشق ہے ۔مجھے اپنی بیوی سے والہانہ محبّت ہے۔

اتفاق سے میری نگاہ سامنے کی کھڑکی پر پڑ گئی۔ شاعر صاحب کی بیوی جھانک رہی تھیں۔ فضول سی تھیں بالکل!

"بکتا ہے یہ شاعر!" میں نے دل میں سوچا۔

"صبح کے دھندلکے میں جب معصوم چڑیا گیت گا رہی ہو گی۔ تب ہم سڑکوں پر سیر کیا کریں گے۔ دوپہر کے وقت میں آپ کو اپنے کلام سے محفوظ کیا کروں گا اور شام کو جب سورج اپنی زرد زرد کرنوں سے زمین کو الوداع کہہ رہا ہو گا، ہم

باغ میں سیر کرنے چلا کریں گے اور میں کلام سنایا کروں گا۔ رات کو میں پھر آپ کو کلام سُنایا کروں گا۔"

نہ پوچھئے کس مصیبت سے ہم نے اس شاعر سے پیچھا چھڑایا۔

ہم لوگ ایک گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ایک رنگین مکان پر نظریں جم گئیں جس پر لکھا تھا "کرائے کے لیے خالی ہے۔" مکان تھا بھی سڑک پر اور بڑا خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ چابیاں انارکلی میں کسی وکیل کے پاس ملیں گی۔ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچے۔ اندر وکیل صاحب نکلے۔ ہم نے اپنا مطلب ظاہر کیا۔ بولے "آپ میٹر کا کرایا فوراً ادا کر دیں گے؟"

"جی ہاں۔" ہم بولے۔

"اور کُل کرائے کا آدھا یعنی نصف کرایہ پیشگی جمع کرا دیں گے؟"

"بہت اچھا۔"

"آپ حلفیہ بیان کرتے ہیں کہ پڑوس میں کسی کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔"

"نہیں پہنچائیں گے۔"

”آپ مکان کے اندر لگے ہوئے قوانین پر عمل کریں گے؟“

ہم نے سر ہلا دیے۔

”آپ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتے ہیں کہ مکان سے کسی قسم کا ناجائز فائدہ تو نہیں اٹھائیں گے؟“

ناجائز فائدہ غالباً ان کا مقصد تانک جھانک سے تھا۔

”نہیں اٹھائیں گے صاحب!“

”اور آپ مکان چھوڑنے سے کم از کم ایک ماہ پہلے حاضر ہو کر اطلاع دیں گے۔“

”ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔“

”اب سیدھے کشمیر بازار جائیے۔ وہاں رام ناتھ حلوائی کی دکان پوچھ لیجئے۔ بالکل اس کے سامنے رام چرن عینک والے کی دکان ہے۔ چابی وہیں ملے گی۔“

ہم دونوں وہاں پہنچے۔ دکان پر لالہ صاحب نہیں تھے۔ ان کے لڑکے کے ساتھ ان کے گھر جانا پڑا جو ڈبی بازار میں تھا۔ ہمیں دیکھ کر لالہ جی بولے۔ ”صاحب میں مکان پر کسی قسم کی خرید و فروخت پسند نہیں کرتا۔ میں نے نہ معلوم کتنی

دفعہ لوگوں سے کہا ہے کہ کم از کم مجھے گھر تو چین سے بیٹھنے دیا کریں۔ عینکیں اور دو کانوں سے بھی مل سکتی ہیں۔"

ہم نے انہیں بتایا کہ وکیل صاحب کے مکان کی چابی چاہیے۔

"اخاہ! وکیل صاحب کا مکان! خوب لطیفہ ہے صاحب۔ یہ وکیل صاحب کا مکان کب سے ہو گیا۔ کل تو بستر بغل میں داب کر یہاں آیا تھا اور آج مالک ہو گیا۔ جناب مکان میرا ہے!"

"بہت اچھا آپ کا سہی! مگر چابی کہاں ہے؟"

"مجھے اچھی طرح معلوم نہیں البتہ آپ چوبرجی جائیے۔ وہاں نمبر پندرہ میں چرنجی لال ٹھیکیدار سے چابی مل سکتی ہے۔"

کوئی مغرب کے وقت چوبرجی پہنچے۔ وہاں لالہ صاحب سے ملے۔ انہیں مقصد بتایا۔ بولے "کیسی چابی؟ کس کی چابی؟ صاحبان آپ کو بڑی غلط فہمی ہوئی۔ مجھے کسی چابی کا پتہ نہیں۔ بہتر یہی ہو گا کہ آپ واپس انارکلی جائیے۔ چابی وکیل صاحب کے پاس ہی ہو گی۔"

پھر ایک وکیل صاحب کے پاس پہنچے۔ انہیں ساری داستان سنائی۔ وہ ہنس کر بولے۔ ”چابی دراصل لالہ چرن کے پاس ہی ہے۔ وہ آپ سے ویسے ہی مذاق کرتے ہوں گے۔“

۔۔۔۔ سبحان للہ یہ مذاق کی بھی ایک ہی رہی۔

”تو پھر آپ اپنا کوئی آدمی ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔“ باقر صاحب نے تجویز پیش کی۔

وکیل صاحب نے دو آدمی ہمارے ساتھ کر دیئے۔ اب چار آدمیوں کا مختصر سا قافلہ سائیکلوں پر روانہ ہوا۔ ان میں سے ایک کے پاس بھی روشنی نہیں تھی۔ طے ہوا کہ آگے پیچھے ہو کر چلیں اور اگر کہیں پولیس والا ہو تو اشارہ کر دیا جائے۔ غرضیکہ عجب بے ڈھنگے پن سے ہم روانہ ہوئے۔ کبھی کوئی کہی نکل گیا۔ کبھی کوئی کسی کو ڈھونڈ رہا ہے۔ بیسیوں مرتبہ کھوئے گئے اور پائے گئے ان دونوں کی حرکات سے پتہ چلتا تھا کہ یہ لوگ چلبلے سے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ایسے کھوئے گئے کہ گھنٹے بھر کی تلاش کے بعد بھی نہ ملے۔ لالہ جی کے ہاں پہنچے، وہ وہاں نہیں تھے۔ پھر واپس انارکلی آئے۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ خیال آیا کہ شاید چوبرجی نہ چلے گئے ہوں۔ وہاں بھی چکر لگا آئے۔ ایک مرتبہ پھر لالہ جی اور

وکیل صاحب کے گھروں کا طواف کیا۔ رات کو گیارہ کے بج گئے۔ چابی نہ ملی نہ وہ کمبخت انسان۔ آخر تنگ آکر واپس ہوسٹل لوٹ آئے۔

رات کو مشورہ کیا گیا کہ کل اینگلو انڈین اور کرسچن حضرات کی کالونی میں مکان تلاش کیا جائے۔ کم از کم وہ لوگ ایسی بد تمیزیاں تو نہ کریں گے۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رات بھر ہم کتنے دل شکستہ رہے اور کیسے کیسے پریشان خواب دیکھتے رہے۔

دوسرے روز صاحب لوگوں کے محلّے کی راہ لی۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو فضا ہی بدلی ہوئی تھی، بچّے سے بوڑھے تک جسے دیکھو بالکل سیاہ تھا۔ جیسے کسی نے زبردستی دھواں لگا دیا ہو۔

بحث شروع ہوئی۔ میں کالے آدمیوں کی طرفداری کر رہا تھا۔ اور باقر صاحب ان کے جانی دشمن تھے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ صرف ایک مکان دیکھیں گے۔ اور پسند آگیا تو خیر! ورنہ فوراً واپس!

ہم ڈرتے ڈرتے سامنے کے مکان میں داخل ہوئے۔ وہاں برآمدے میں ایک کالا کلوٹا بچّہ ایک پتلی سی چھڑی سے ایک موٹے ستون کو ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔ غالباً اس کی یہ حرکت محض تفریحاً تھی۔ اتنے میں ایک بھاری سی میم صاحبہ

نکلیں اور انگریزی میں چلّا کر بولیں۔ ''ولیم! کتنی دفعہ تم سے کہا کہ اس ستون کو اس بری طرح نہ ٹھوکا کرو۔ کسی دن یہ سارے کا سارا مکان سر پر آپڑے گا۔''

ہم نے مکان کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے اشارے سے بتایا کہ وہ رہا۔ ہم نے شکریہ ادا کیا۔ وہ مسکرائیں اور ان کے دانت اس طرح چمکے جیسے اندھیری گھٹا میں بجلی چمکا کرتی ہے۔ اب جو مکان جا کر دیکھتے ہیں تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ایک بالکل بیہودہ مکان جس میں غالباً دروازوں اور دیواروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ہو گا قبل از مسیح سے بھی پہلے کا۔ دیواروں پر طوفانِ نوح کے نشانات تھے۔ مکان سے غدر کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ اندر جا کر دیکھتے ہیں تو سب کچھ ٹوٹا پھوٹا ہوا۔ بالکل اُلٹ پُلٹ۔ باقر صاحب بولے۔ ''بھئی غلطی ہوئی ہو گی۔''

جیب سے اخبار نکال کر پڑھا۔ وہی مکان تھا۔ واپس لوٹنے لگے۔ باقر صاحب بولے۔ ''چلو انگریزوں کی طرف بھی ایک مرتبہ قسمت آزمائی کرتے ہیں۔''

وہاں پہنچے۔ ایک انگریز سیٹی بجاتا جا رہا تھا۔ اس سے پوچھا۔ اس نے زبان کو اچھی طرح تاڑ مروڑ کر جواب دیا کہ ہاں وہ سامنے رہا مکان۔ مکان دیکھا۔ نیچے ہوٹل تھا اور پڑوس میں سینما تھا۔ ہوٹل کے سامنے بے شمار تانگے کھڑے تھے۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ چپڑاسی بولا۔ ''جناب ایسے مکان کہاں ملتے ہیں۔ ذرا کھڑکی میں آ بیٹھئے اور سامنے رونق ہی رونق ہے۔ طبیعت گھبرائی تو فوراً کوٹ سنبھالا اور

کھٹ سے سینما میں پہنچ گئے۔ کبھی جی چاہا تو جلدی سے نیچے ہوٹل میں آ بیٹھے۔ ناچ واچ میں کوئی حرج نہیں۔ کوئی چیز منگوانا ہو تو بس (چٹکی بجا کر) منٹوں میں آ جاتی ہے۔"

"اور کرایہ؟"

"دو سو روپے۔"

ہم واپس چلنے لگے کہ اتنے میں ایک صاحب جو سوٹ پہنے تھے۔ اندر تشریف لائے اور بولے۔ "جناب آپ طالب علم معلوم ہوتے ہیں۔ ہم آپ کو رعایت دے سکتے ہیں۔"

"کتنی۔"

"ہم ڈھائی روپے کم کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ!"

ہم پھر واپس ہوسٹل آ رہے تھے۔ سوچنے لگے کہ بس اب کی مرتبہ آخری حملہ کیا جائے۔ کیونکہ دو روز ضائع ہو گئے تھے اور امتحان میں کُل بیس روز رہ گئے تھے۔ اف خدایا، صرف بیس روز۔ میں کانپ اُٹھا۔

باقی سب جگہ دیکھ چکے تھے۔ اب صرف شہر کا گنجان حصّہ باقی رہ گیا تھا۔

ہم دونوں پھر چل کھڑے ہوئے۔ لوگوں سے پوچھتے جا رہے تھے کہ کسی نے سامنے اشارہ کر کے کہا۔ اوپر کی منزل خالی ہے۔ ہم نے درواز کھٹکھٹایا۔ کھڑکی میں سے ایک بچّہ جھانکنے لگا۔ وہ چلا گیا۔ پھر ایک لڑکا آیا۔ اسکے بعد ایک لڑکی آئی وہ بھی چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں ایک عورت آئی اور اس کے بعد ایک بڑھیا۔۔۔ پھر کوئی نہ آیا۔

ہم نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔

"پتا جی گھر میں نہیں۔" آواز آئی۔

"ہمیں پتا جی سے کوئی واسطے نہیں۔ ذرا تم میں سے کوئی باہر تو نکلو۔"

"آپ کو کہیں دولت رام ٹھیکیدار نے تو نہیں بھیجا؟" اندر سے آواز آئی۔

باقر صاحب جلدی سے بولے۔ "ہاں بھیجا ہے۔"

کھٹ سے کھڑکی بند ہو گئی۔ قصّہ ختم، بے شمار آوازیں دینے پر بھی کوئی نہ بولا۔ آگے چلے۔ تاریک گلیاں، دونوں طرف عظیم الشان مکان! ایک جگہ پتہ چلا کہ

نزدیک ہی ایک حویلی خالی پڑی ہے۔ وہاں جا کر دیکھتے ہیں کہ بندر کا تماشا ہو رہا تھا۔ دروازوں، چھتوں، منڈیروں، کھڑکیوں غرضیکہ جہاں دیکھو عورتیں، مرد، بچّے کھڑے تھے۔ ہم جو وہاں گئے تو دوسرا تماشا شروع ہو گیا۔ سب کے سب ہمیں گھور گھور کے دیکھنے لگے۔

"کتنے بد تمیز لوگ ہیں۔" باقر صاحب بولے۔

بمشکل اس ہجوم میں سے گزرے، مکان دیکھا تو اچھا تھا۔ کرایہ پوچھا۔

"اڑتالیس روپے پانچ آنے چارپائی۔" معلوم ہوا کہ مالک مکان بنئے تھے۔ لہذا اپنی عادت سے مجبور تھے۔

"آپ انہیں کب ساتھ لائیں گے؟" لالہ جی بولے۔

"ہم شام تک سامان وغیرہ لے آئیں گے۔" باقر صاحب بولے۔

"جی نہیں، آپ کی وہ کب آئیں گی؟"

"میری وہ۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"آپ شادی شدہ ہیں نا؟۔۔۔۔۔ دونوں صاحبان؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر آپ تشریف لے جایئے۔ یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ یہاں سب کنبہ دار آدمی رہتے ہیں۔ امید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔"

اور ہم دونوں کھسانے ہو کر لوٹے۔ سوچا کہ اب کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے کہ ہاں شادی شدہ ہیں۔ باقر صاحب نے صدقِ دل سے قسم کھائی کہ اگر اس دفعہ بھی مکان نہ ملا تو واپس ہوسٹل چلے جائیں گے۔ کوئی ایک گھنٹے کی آوارہ گردی کے بعد ایک خالی مکان کا پتہ چلا۔ مکان تو اچھا مگر اس کی حدودِ اربعہ عجیب تھا۔ پڑوس میں ایک بیہودہ سا سینما تھا۔ پیچھے گدھے بندھے ہوئے تھے۔ ہم نے پوچھا۔ "یہ شور تو نہیں مچائیں گے؟" لالہ جی بولے۔ "اوّل تو یہ گدھے ہیں ہی شریف۔ میرا مطلب ہے سیدھے سادے ہیں۔ صرف صبح اور شام کو شور مچاتے ہیں۔ ذرا رونق ہو جاتی ہے۔ پھر آپ ایک ہفتے تک عادی ہو جائیں گے۔ وہ دیکھئے پنڈال سامنے ہے۔ ہر تیسرے روز وہاں جلسہ ہوتا ہے۔ وہ رہی پنواڑی کی دکان۔ ساتھ ہی نائی بھی ہے۔ یہاں نیچے دہی بڑے والا بیٹھتا ہے۔" لالہ صاحب نے بے شمار خوبیاں گنوادیں۔

کرایہ ساٹھ روپے تھا۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کیسا شریف ہے یہ شخص۔ اس نے شادی کے بارے میں پوچھا تک نہیں۔ باقر صاحب کو جوش آیا تو بول اٹھے۔ "اور جناب ہم شادی شدہ ہیں۔"

"افوہ! یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ مگر آپ دونوں کی شریمتیاں ہیں کہاں؟"

"جی میکے گئی ہوئی ہیں۔ چند ماہ تک آجائیں گی۔" میں نے ذرا شرما کر کہا۔

"خوب اور آپ کی؟"

"سرگباش ہو گئیں پچھلے مہینہ! تبھی تو بے گھر ہوا پھر رہا ہوں۔" باقر صاحب رنجیدہ ہو کر بولے۔ مجھے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔ ادھر لالہ جی کے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اجی پرماتما کسی کو بیوی کی موت کا غم نہ دے۔ بس کمر ہی ٹوٹ جاتی ہے انسان کی۔ میں تو خود یہ دُکھ جھیلے ہوئی ہوں۔ کوئی بچّہ تو نہیں چھوڑا بچاری نے؟"

"ایک بچّی تھی۔ دو تین مہینے کے بعد پرلوگ سدھار گئی "۔ باقر صاحب جھوٹ موٹ روتے ہوئے بولے۔

"آہ آپ دکھیا ہیں۔۔۔۔۔ آپ کون سے کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"ہم نے کالج کا نام بتا دیا؟"

کالج کا نام بتانا تھا۔ کیا تو لالہ جی رونے کی کوشش کر رہے تھے اور کیا ایک دم چونک پڑے۔

"صاحبان معاف کیجئے۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ میں آپ کو مکان نہیں دے سکتا۔"

"آخر کیوں؟" ہم حیران رہ گئے۔

"آپ کے کالج کا ایک لڑکا یہاں رہا کرتا تھا۔ وہ سامنے کے مکان سے ایک اُستانی کو بھگا کر لے گیا۔ چار سال سے ان دونوں میں سے کسی کا پتہ نہیں چلا۔ ہم نہیں چاہتے کہ محلّے میں کہیں دوبارہ اس قسم کی واردات ہو۔"

ہم نے اس نامعقول لڑکے کو کوس ڈالا۔

شام کا وقت تھا۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کو واپس جا رہے تھے۔ ادھر ہم دونوں زمین پر نظریں گاڑے ہوسٹل کی طرف واپس آ رہے تھے۔ باقر صاحب شاید غور کر رہے ہوں گے کہ کس کے جوتوں پر زیادہ گرد جمع ہے۔ دل میں جو کچھ تھا سو تھا ہی۔ بظاہر ہم دونوں مُسکرا رہے تھے۔

"سراسر بیہودگی ہے یہ مکان ڈھونڈنا۔" باقر صاحب بولے۔

"بالکل!" میں نے کہا۔

ہم دونوں ہنس پڑے۔

ویسے بھی سنتے ہیں کہ صبح کا بھولا شام کو واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں سمجھنا چاہیے۔

ختم شد